اردوئے قدیم اور چشتی صوفیاء

ڈاکٹر الف ۔ د۔ نسیم

مقتدرہ قومی زبان
پاکستان

اُردوئے قدیم اور چشتی صوفیاء

ڈاکٹر الف ۔ د۔ نسیم

مقتدرہ قومی زبان
پاکستان

سلسلہ مطبوعات : ۳۳۳

عالمی معیاری کتاب نمبر ۳ - ۱۸۲ - ۴۷۴ - ۹۶۹ - ISBN

130/44

طبع اوّل ـــــــ ۱۹۹۷ء

تعداد ـــــــ پانچ سو

قیمت ـــــــ ۱۰۰ روپے

فنی تدوین ـــــــ ڈاکٹر انعام الحق جاوید

پروف خوانی ـــــــ حاجی غلام مہدی

سرِورق ـــــــ قسور علی خاموش

اہتمام ـــــــ اجمل وجیہہ

مطبع ـــــــ مینیجر، پرنٹنگ کارپوریشن آف پاکستان پریس، اسلام آباد

ناشر ـــــــ افتخار عارف
صدر نشین
مقتدرہ قومی زبان
پطرس بخاری روڈ، ایچ ۸ / ۴
اسلام آباد۔

پیش لفظ

نفاذ و ترویج اُردو کے حوالے سے مقتدرہ نے مختلف جہتوں میں کئی اقدامات کیے ہیں جن میں حوالہ جاتی کتب کی اشاعت کے علاوہ اردو زبان کے ابتدائی سفر اور ارتقائی مراحل سے متعلق معلومات یکجا کر کے صاحبانِ علم تک پہنچانے کا سلسلہ بھی وقتاً فوقتاً جاری رکھا گیا۔

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ اردو کی لسانی بنیادیں تہذیبی اور ثقافتی تاریخ میں پنہاں ہیں اور یہ تاریخ ہمارے دینی ادب اور تصوّف کی روایات کے ذریعے آگے بڑھتی رہی ہے اس لیے اس جانب بھی توجہ دینا لازم آتا ہے۔ اُردو زبان کی نشو و نما میں چشتی صوفیاء کا کردار نہایت اہم ہے انھوں نے برصغیر کے باشندوں میں تبلیغ اسلام کے لیے جس زبان کو اپنایا وہ یہاں کی اس وقت کی عوامی زبان تھی۔ ان بزرگان نے پہلے اس زبان کو خود سیکھا اور پھر اس کے ذریعے تبلیغ کے سلسلے کو آگے بڑھایا۔ ان کے تذکروں میں ہندی گوئی یا ہندی دانی کا جو ذکر ملتا ہے اس سے مراد عربی فارسی آمیز وہی زبان ہے جو اردو کی ابتدائی اور قدیم شکل کہلاتی ہے۔

اس کتاب میں فاضل مصنف نے اُردو زبان کے ارتقا اور اس کی نشو و نما کے حوالے سے چشتی صوفیاء کی علمی و دینی خدمات کو انتہائی تحقیقی انداز میں اکٹھا کر کے پیش کیا ہے۔ امید ہے کہ محققین، طلبہ اور اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے عام قارئین کے لیے یہ کتاب معلومات افزا ہو گی۔

افتخار عارف

فہرست

پس منظر

طبقۂ صوفیا میں جس کا تعلق برصغیر سے ہے بزرگانِ چشت اور ان کے سلسلۂ چشتیہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کفرستانِ ہند میں سہروردی، قادری اور نقشبندی بزرگوں نے بھی بہت قابل قدر کام کیا ہے لیکن ان کے کام کی کیفیت و کمیت صوفیائے چشت کے کام سے کئی اعتبارات سے مختلف ہے۔ بزرگان چشت نے جس زمانے اور جس پیمانے پر برصغیر میں نورِ توحید پھیلایا ہے وہی ان کے مسلک کی اہمیت اور ان کے سلسلے کی انفرادیت متعین کرنے کے لیے کافی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں کے قدم (فاتح کی حیثیت سے) ابھی تک سندھ اور پنجاب سے آگے نہیں بڑھے تھے اور دلّی اور اس کے گرد و نواح پر ابھی تک کفر کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ اگرچہ تھوڑے عرصہ بعد خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ (سردارِ چشتیانِ ہند) کے نقش قدم کے طفیل یہ حالت ختم ہوگئی تھی اور تخت دہلی شہاب الدین غوری کے قدم چوم رہا تھا لیکن جس وقت خواجہ بزرگ خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے اجمیر دہلی اور اس کے گرد و نواح میں اشاعت اسلام کا کام شروع کیا تھا اس وقت اس علاقے میں تقریباً غیر مسلم ہی آباد تھے اور کئی اعتبارات سے بالادستی بھی انہی کی تھی۔ ایسے ماحول اور حالت میں خواجہ بزرگ اور ان کے خلفا کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا اور انھوں نے اس کے باوجود جس بلند ہمتی، بے خوفی اور بے جگری سے اسلام کا جھنڈا بلند کیا ہوگا اس کا آج تصور بھی مشکل ہے۔

خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خلفا کے لیے صرف یہی مشکل نہ تھی کہ برصغیر کی سیاسی، مذہبی اور ثقافتی فضا ان کے لیے اجنبی تھی بلکہ لسانی ماحول بھی ان کے

موافق نہ تھا۔ ان کی اپنی زبان فارسی تھی لیکن مقامی لوگ اس سے ناواقف تھے۔ اس وقت پورے برصغیر میں پراکرتوں کی اپ بھرنش شاخیں رائج تھیں۔ پراکرتیں وہ زبانیں تھیں جو برہمنوں کی سنسکرت پر اجارہ داری کے ردِّعمل کے طور پر از خود عوام میں پیدا ہوگئی تھیں۔ پالی، مگدھی، اردومگدھی وغیرہ ایسی ہی عوامی زبانیں تھیں۔ انہی پراکرتوں نے صدیوں کے ارتقا کے بعد جب نئی شکلیں اختیار کیں تو اپ بھرنش کے نام سے موسوم ہوئیں۔ صوفیائے چشت کی برصغیر میں آمد کے زمانے میں ملک کے مختلف حصّوں میں اپ بھرنش ہی کی مختلف بڑی اور ذیلی شکلیں رائج تھیں۔ شمال میں مشرقی پنجاب سے لے کر بہار تک اور پھر جنوب مغرب میں گجرات اور راجستھان کے علاقے تک شورسینی اپ بھرنش کی ایک شکل مغربی ہندی کا عمل دخل تھا۔ کھڑی بولی، ہریانوی، راجستھانی، گوجری، دہلوی، برج بھاشا وغیرہ اس مغربی ہندی ہی کی مختلف شاخیں تھیں۔ جاٹو اور بنگارو بھی اسی ضمن میں آتی ہیں یہ انبالہ (مشرقی پنجاب) کے علاقے میں بولی جاتی تھیں۔ یہ دراصل ہریانوی ہی کے دو رُخ تھے۔ مغربی ہندی کے علاقے کے شمال مغرب میں پنجابی اور اس کی شاخیں لہندی (ملتانی) اور ہندکو بولی جاتی تھیں۔ جنوب میں جہاں راجستھانی اور گوجری اثر ختم ہوتا ہے وہاں مرہٹی کا عمل دخل تھا۔ مشرق میں مشرقی ہندی اور اس کی ہمسایہ زبانیں اودھی، بگھیلی اور چھتیس گڑھی تھیں۔ شمال مشرق اور اس کے شمال میں گڑھوالی، کمایونی، نیپالی وغیرہ پہاڑی بولیوں کا اثر تھا۔ انتہائی شمال اور شمال مغرب میں سندھی اور پشتو اور انتہائی مشرق میں بنگالی، آسامی، اڑیا اور بہاری بولیاں مثلاً متھیلی، مگھی وغیرہ مروج تھیں۔ انتہائی جنوب میں دراوڑی بولیاں مثلاً تلیگو، کنڑی، تامل وغیرہ حکمران تھیں۔

صوفیائے چشت کو سب سے پہلے جس علاقے کی زبان اور بولیوں سے واسطہ پڑا وہ وہی علاقہ تھا جس پر مغربی ہندی کا قبضہ تھا۔ یہ علاقہ مشرقی پنجاب میں سرہند شریف سے لے کر مشرق میں الہ آباد تک اور شمال میں کوہ ہمالیہ کے دامن سے لے کر جنوب میں بندھیاچل اور روہیل کھنڈ تک تھا۔ قنوجی، راجستھانی، دہلوی، کھڑی بولی، ہریانوی جاٹو، بنگارو، برج بھاشا اسی علاقے کی زبانیں اور بولیاں تھیں۔ اس علاقہ میں دلی ایسا

خطہ تھا جو ان مختلف بولیوں اور زبانوں کا مقام اتصال سمجھا جاتا تھا ان میں کسی ایک زبان یا بولی کا اثر کم یا زیادہ ضرور ہو سکتا ہے لیکن ان بولیوں اور زبانوں کے مخلوط اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ماہرین لسانیات کی رائے میں ان سب میں غالب اثر برج بھاشا کا تھا جو دوآبہ کی زبان تھی۔ اس برج بھاشا کا غالب اثر لیے ہوئے دلّی اور اس کے گرد و نواح میں بولی جانے والی زبان نے ایک عرصہ بعد عربی، ترکی اور فارسی الفاظ کی آمیزش سے ایک نئی زبان کی تشکل اختیار کر لی تھی جو پہلے ہندی (ہندوی) اور پھر ریختہ اور اُردو کے نام سے موسوم ہوئی۔

تخت دلّی کے مسلمانوں کے قبضہ میں آجانے کے بعد اس علاقے کی زبانوں میں خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خلفا اور مریدوں نے کافی کام کیا ہے۔ ان میں عربی فارسی وغیرہ کے الفاظ کس حد تک دخیل ہو گئے تھے اس کا اندازہ اس دور کی ان تصانیف سے ہو سکتا ہے جو راجپوتوں کی جنگی اور مذہبی روایات پر مشتمل ہیں۔ یہ کتابیں کھومان راسو، بیسل دیو راسو، پرتھوی راج راسو، جے چند پرکاش راسو، ہمیر راسو، جے پال راسو، وغیرہ کے ناموں سے دوہوں کے رنگ میں قدیم بھاشا میں لکھی گئی ہیں۔ ان میں عربی اور فارسی کے کئی الفاظ نظر آتے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو بگڑی ہوئی شکل میں ہیں جیسے نیزہ کی جگہ نیجا، تازیانہ کی جگہ تاجیو وغیرہ بروائی اور کچھ صحیح املا اور تلفظ کے ساتھ ہیں جیسے محل، انعام وغیرہ۔ ان تصانیف میں دلی کے آخری ہندو راجہ پرتھوی راج کے وزیر، دوست اور درباری شاعر چند بروائی کی تصنیف بنام پرتھوی راج راسو کا مطالعہ خاص طور پر مفید ہو گا کیوں کہ اس میں ایسے پھلوں، پھولوں، اسلحہ اور لباس کے نام بھی ملتے ہیں جو مسلمانوں کے ساتھ اس علاقے میں آئے تھے۔ اس کتاب میں گلاب، سیب، اخروٹ، نارنگی، صلح، تیغ، زرہ، کمان، تیر، ترکش، ہدف، نشان، نوبت، شہنائی، عراقی اور تازی جیسے اسما و الفاظ کا وجود راجستھانی پر فارسی اثرات کا بیّن ثبوت بہم پہنچا رہا ہے۔ بعض ماہرین لسانیات نے اس کتاب میں اس قسم کے الفاظ کی موجودگی ہی کی بنا پر اس شبہ کا اظہار کیا ہے کہ شاید یہ کتاب بعد کے دور کی ہے۔ حالانکہ اگر وہ خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے تبلیغی کام کے علاقے، زمانے، اور ان کے کام کی گہرائی اور گیرائی کو مدنظر رکھتے تو یہ نتیجہ مرتب نہ کرتے اور ضرور اس فیصلے پر

پہنچتے کہ لشکریان اسلام کی یلغار اور ان کے ساتھ ساتھ چشتیہ بزرگوں کی تبلیغی اور تلقینی کوششوں کی بنا پر ایسا ممکن تھا کہ عربی فارسی الفاظ مقامی زبانوں میں داخل ہو جاتے خصوصاً ایسی کتابوں کی زبان میں جن کا وجود ہی ہندؤں اور مسلمانوں کے مذہبی، تہذیبی اور سیاسی تصادم کا مرہونِ منت تھا۔

یہ لسانیاتی آمیزش بادی النظر میں کتنی ہی غیر اہم کیوں نہ نظر آتی ہو اس کی حقیقت اور اہمیت تقابلی لسانیات کے علماء ہی جانتے ہیں۔ ان کے نزدیک دنیا میں جہاں کہیں بھی مختلف اللسان اور مختلف المذاہب اقوام کا اس طرز اور اس انداز میں وسیع پیمانے پر تادیر میل میلاپ ہو رہا ہے کہ ان میں سے ایک فاتح اور دوسری مفتوح ہو یا ایک اثر انداز اور دوسری اثر پذیر ہونے کی حیثیت اور صلاحیت رکھتی ہو تو ایک نئی ثقافت اور ایک نئی زبان نے ضرور جنم لینا ہوتا ہے۔ برصغیر میں یہ صورتِ حال اگرچہ عرب فاتحین کے سندھ میں داخل ہونے کے ساتھ ہی شروع ہو گئی تھی لیکن اس کے لیے صحیح مناسب اور ساز گار فضا فتح دہلی کے قریبی زمانے میں دارالسلطنت دہلی اور اس کے گرد و نواح کے علاقے میں پیدا ہوئی ہے جہاں صوفیائے چشت نے ابتدائی مراحل میں تبلیغ و تلقین کا کام کیا ہے، اور جو ماہرین لسانیات کی اکثریت کے نزدیک اُردو زبان کی اصل جنم بھومی ہے۔

یہاں یہ خیال پیدا ہونا بھی یقینی ہے کہ آخر ایسا لسانیاتی آمیزش کا عمل گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی میں فتح دہلی کے بعد، دہلی اور اس کے اردگرد کے علاقے ہی میں کیوں بار آور اور نتیجہ خیز ہوا جب کہ مسلمان فاتح کی حیثیت سے اس سے صدیوں پہلے سندھ کے علاقے میں داخل ہو چکے تھے۔ اس کے جواب کے لیے ہمیں اس زمانے کے عہد بہ عہد لسانیاتی عمل اور اس کے پس منظر کا جائزہ لینا ہو گا۔

عربوں کے ہراول لشکر تو خلفائے راشدین کے زمانے ہی میں پہلے حکم بن عمرو ثعلبی اور پھر عثمان ابن العاص کی کمان میں مکران اور وہاں کے ساحلی علاقوں کے ساتھ ساتھ بمبئی کے نزدیک تانہ تک پہنچ گئے تھے لیکن سندھ پر باقاعدہ فوج کشی محمد بن قاسم کی سپہ سالاری میں ہوئی جس نے دو سال کے عرصہ میں سندھ اور اس کے آگے ملتان تک کا علاقہ

سلطنت اسلام میں شامل کر لیا جس کے نتیجے کے طور پر سندھ اور عرب کے روابط سیاسی حدود سے نکل کر ثقافتی میدان میں بھی داخل ہو گئے۔ سید سلیمان ندوی نے عرب و ہند کے تعلقات کے عنوان سے قدیم تاریخی مآخذات کے حوالوں پر مشتمل جو کتاب لکھی ہے اس سے ان دونوں علاقوں کے علمی، ادبی اور ثقافتی رشتوں پر تفصیلی روشنی پڑتی ہے لیکن ان رشتوں اور روابط کے باوجود یہاں عربی اور مقامی زبان میں صرف لغت کی حد تک مفاہمت ہو سکی جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ عربوں نے سندھ کو وسیع پیمانہ پر آبادکاری کے لیے منتخب نہ کیا اور وہ اس پر ایک مقبوضہ ملک کی حیثیت سے حکومت کرتے رہے جس سے دو قوموں میں وسیع اور تادیر اختلاط کا صحیح اور مناسب موقع پیدا نہ ہو سکا اور پھر اس علاقے میں قرامطیوں کے فتنہ و فساد اور زور کی بنا پر یہاں صوفیا بھی اس آب و تاب اور کثرت سے پیدا نہ ہو سکے جو دو قوموں میں دوری کی خلیج کو پاٹ سکتے۔ اس زمانے کے ایک شیخ ابو تراب (متوفی ۷۸۸ء) کا ذکر میر علی شیر قانع نے اپنی تصنیف تحفۃ الکرام میں کیا ہے۔ یہ تبع تابعی تھے، کچھ لوگ اور بھی ضرور ہوں گے لیکن جس انداز اور جس پیمانے پر فتح دہلی کے قریبی اور بعد کے زمانے میں صوفیا خصوصاً صوفیائے چشت عوام پر اثر انداز ہوئے ہیں، یہ صورت حال سندھ میں عربوں کے دور اقتدار میں بالکل پیدا نہیں ہو سکی۔

غزنوی سلاطین نے جب پنجاب کو فتح کیا اور لاہور کو دارالحکومت بنا کر سندھ تک کا علاقہ اپنے اثر یا عمل داری میں شامل کر لیا تو اس زمانے سے لے کر غوریوں کی فتح دہلی تک کے تقریباً دو سو سال کے زمانے میں غیر مسلموں اور مسلمانوں میں ایک حد تک سیاسی روابط اور لسانی رشتوں کا استوار انداز ضرور نظر آتا ہے جس میں اس دور کے مشہور صوفیا کا ہاتھ بھی دکھائی دیتا ہے۔ شیخ علی عثمان ہجویری المعروف داتا گنج بخش لاہوری ایسے ہی صوفیاء میں سے ایک ہیں جنھوں نے غیر مسلموں میں تبلیغ کے عوامی انداز سے عربی فارسی الفاظ کو مقامی زبان میں منتقل کرنے کا غیر شعوری اور غیر ارادی طور پر وسیع اور مؤثر کام کیا ہے۔ یہ وہی بزرگ ہیں جن کے مزار پر برصغیر میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ چلہ کش بھی رہے تھے۔

غزنوی دور کے فارسی شاعروں کے کلام میں ہندی یا مقامی زبان کے جو الفاظ دکھائی دیتے ہیں ان سے بھی دو زبانوں کے اشتراک عمل کا تھوڑا بہت اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس عہد کے مشہور فارسی شاعر مسعود سعد سلمان کے متعلق تو بعض تذکرہ نگاروں نے یہاں تک لکھا ہے کہ انھوں نے مقامی زبان یا ہندی میں ایک دیوان بھی مرتب کیا تھا جو اب نایاب ہے۔ امیر خسرو نے غرۃ الکمال کے دیباچے اور محمد عوفی نے لباب الالباب میں کہا ہے کہ ان کے تین دیوان تھے ایک عربی، دوسرا فارسی اور تیسرا ہندی ۔ پنجابی زبان اور اُردو میں بعض مشترکہ لسانی خصوصیات کے ساتھ مسعود سعد سلمان کے اس ہندی دیوان کی خبر سے حوصلہ پاکر ہی حافظ محمود شیرانی نے اپنی تصنیف "پنجاب میں اُردو" میں پنجاب کو اردو زبان کی جنم بھومی اور پنجابی زبان کو اُردو کی ماں کہا ہے جس سے دوسرے ماہرین لسانیات نے اس لیے اتفاق نہیں کیا کہ یہ مشترکہ خصوصیات تو مغربی ہندی کی شاخیں ہونے کی بنا پر پنجابی اور اُردو کے علاوہ دوسری زبانوں مثلاً برج بھاشا اور اُردو کھڑی بولی اُردو اور ہریانوی اور اُردو میں بھی پائی جاتی ہیں۔ ہندی فارسی اور عربی الفاظ کی آمیزش کا اصل خطہ ان کے نزدیک دہلی اور اس کے گرد و نواح کا علاقہ ہی ہے۔ یہی ان کے نزدیک صحیح معنوں میں اُردو کی جنم بھومی ہے اور یہاں کی زبان برج بھاشا یا برج بھاشائی اثرات لیے ہوئے کھڑی بولی ہی اُردو کی ماں ہے۔

یہ دو امور طے ہو جانے کے بعد کہ جس علاقے کو اردو زبان کی "ولادت گاہ" کہنا چاہیئے وہ دہلی اور اس کے گرد و نواح کا علاقہ ہی ہے اور اس علاقے کے غیر مسلموں میں سب سے پہلے جس طبقہ نے تبلیغ و تلقین کی غرض سے عوامی رابطہ پیدا کیا وہ صوفیائے چشت کا گروہ ہی ہے یہ دیکھنا باقی ہے کہ صوفیا نے یہ عوامی رابطہ کیسے پیدا کیا اور اس کے مذہبی اثرات کے علاوہ کیا لسانی نتائج مرتب ہوئے۔

کسی ایسے ملک میں جس کے لوگ اجنبی، جس کا مذہب نامانوس، جس کی تہذیب الگ اور جس کی زبان بیگانہ ہو جب بھی کوئی فاتح لشکر داخل ہوتا ہے تو فاتح لشکر کے امراء وزراء اور بادشاہ تو نئے ملک کی سیاسی صورت حال سنبھالنے اور اس کے انتظامی ذرائع

کو مجتمع کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں اور خود لشکری میدانِ جنگ اور چھاؤنیوں تک محدود رہتے ہیں لیکن اس سارے ماحول میں جو طبقہ بے خوف ہو کر عوام کے قریب اور ان کے دلوں تک پہنچتا ہے وہ صرف مبلغین کا گروہ ہوتا ہے جو حکومت کی پشت پناہی یا اس کے بغیر ہی اپنا پیغام لوگوں کے ہر طبقہ اور ملک کے ہر گوشے میں پہنچانے کا کام شروع کرتا ہے جیسا کہ انگریزوں کے دور میں ہم نے برصغیر میں انگریز حاکموں کو تو درباروں، دفتروں اور کوٹھیوں تک اور انگریز فوجیوں کو چھاؤنیوں تک محدود دیکھا لیکن ان کے مشنریوں کو جگہ جگہ گرجوں، چوکوں، ہسپتالوں، بازاروں، اور تہواروں میں مصروفِ تبلیغ و تلقین پایا۔

مسلمان فاتحین نے بھی جب دہلی اور اس کے گرد و نواح کا علاقہ فتح کیا یا اس کے بعد جب ان کے لشکر جنوب میں دکن، اور مشرق میں بہار اور بنگال پہنچے تو جس گروہ نے عوامی رابطہ کے ذریعے اصلاحِ معاشرہ اور اشاعتِ دین کا فرض سرانجام دیا وہ بھی صرف درویشوں اور درویش علماء پر مشتمل تھا۔ ان میں سے اکثریت کا مسلک چشتیہ تھا۔ اس میدان میں دوسرے سلسلوں کے جو بزرگ نظر آتے ہیں وہ بھی چشتیہ بزرگوں کی ہم جلیسی اور ہم انیسی کے تار میں بندھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس لیے ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ اس ملک میں (یعنی برصغیر میں) ایک نئی زبان کے معرضِ وجود میں آنے کے لیے فاتح اور مفتوح میں جس قسم کے اختلاط کی ضرورت ہوتی ہے اسے پیدا کرنے میں اس دور کے بزرگانِ چشت کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

کسی مذہب، مسلک یا تحریک کی اشاعت اور اس کے نظریات و اصول کے دوسروں تک ابلاغ کے لیے اس کے سرپرستوں اور کارکنوں کو ایسی زبان کا سہارا لینا پڑتا ہے جس کو ان کے مخاطب آسانی سے سمجھ سکیں ورنہ قوتِ گویائی و شنوائی کے باوجود مبلغین کی حیثیت گونگوں اور سامعین کی حالت بہروں کی سی ہوگی قرآن کریم کے عربی زبان میں نازل ہونے کا سبب بھی یہی تھا کہ اس کے ابتدائی مخاطب عرب تھے اگر پیغامِ ربانی کی زبان عربی کی بجائے کوئی اور ہوتی تو یہ خداوند کریم کی حکمتِ بالغہ کے خلاف ہوتا۔ یہی صورت برصغیر میں پیش آئی ہے ہمارے ابتدائی صوفیائے چشت یا ان کے خلفاء نے جو صرف عربی

فارسی پڑھتے ہوئے بھے جب تک اپنے علاقے کے مخاطبین کی زبان سے واقفیت پیدا
نہیں کر لی ہو گی مقامی لوگوں تک اسلام اور اس کے اصولوں کا ابلاغ نہیں کر سکے ہوں گے
یہاں کے جوگیوں، یوگیوں، گورکھ ناتھیوں، گورکھ پنتھیوں اور بدھ سدھوؤں کی شعبدہ بازی
اور مذہب اشتری کا مقابلہ کرتے اور مقامی آبادی کو بے دینی اور شرک کے جال سے نکالنے کے لیے
یقیناً ان بزرگانِ دین کو اس علاقے کی مقامی اور عوامی زبان سے آشنا ہونا پڑا ہو گا جس کے
بغیر وہ تبلیغ و تلقین کا منصب پورا نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ شارح اکھروٹی نے لکھا ہے کہ:

"یہ وہم نہ کریں کہ اولیاء اللہ نے عربی زبان کے سوا بات نہیں کی کیونکہ جملہ اولیاء
اللہ ملک عرب سے مخصوص نہ تھے بس جس ملک میں کہ وہ تھے اس ملک کی زبان
کو کام میں لائے اور گمان نہ کریں کہ کسی بزرگ نے ہندی زبان میں کلام نہیں
کیا۔"
(فارسی سے ترجمہ)

اس دَور کے بزرگوں کے حالاتِ زندگی، ملفوظات و اقوال، اور لسانی و ادبی
رجحانات و ترغیبات سے بھی اس رائے کی تصدیق ہوتی ہے اور پتہ چلتا ہے کہ بزرگانِ
چشت نے اپنے ابتدائی اور وسطی تبلیغی زمانوں میں عربی اور فارسی آمیز ہندی کو اپنے خیالات
و احساسات اور جذبات و واردات کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے اور اس طرح اُردو کی عظیم
عمارت کی تعمیر کے سلسلے میں بنیاد پڑی اور دیوار استواری کا کام بدرجۂ احسن سرانجام دیا ہے۔
ہندی یا ہندوی سے مراد یہاں وہ بھاشا نہیں جو دیوناگری رسم الخط میں ہندوؤں
کے ہاں رائج ہے بلکہ یہ ایک وسیع المعنی لفظ ہے۔ جسے اس وقت کے مورخ اور تذکرہ نگار
برصغیر کی ہر زبان کے لیے استعمال کرتے دکھائی دیتے ہیں خواہ اس کا اپنا علاقائی نام کچھ ہی
کیوں نہ ہو۔ چنانچہ قدیم تذکرہ نگاروں نے پنجابی، گوجری، دکنی، مرہٹی وغیرہ کے لیے
ہندی کا لفظ بھی استعمال کیا ہے مثال کے طور پر جنوبی ہند کے مشہور چشتیہ بزرگ شاہ
برہان الدین نے اپنی شاعری کی زبان کو جو دراصل گوجری ہے ہندی ہی کہا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"عیب نہ راکھے ہندی بول"

مرد فقیر حضرت باوا فرید الدین گنج شکر کی اولاد میں سے ایک شاعر تھے انھوں نے

پنی پنجابی نظم کے بارے میں کہا ہے۔

"نثر فارسی نوں چھڈ اساں نے ہندی نظم بنائی"

اردو کی قدیم اور ابتدائی شکلوں کے لیے بھی مورخوں اور تذکرہ نگاروں نے ہندی یا ہندوی کا لفظ ہی استعمال کیا ہے۔ اور یہ نام اردو زبان کے لیے اس زمانے میں بھی استعمال ہوا ہے جب اسے واضح طور پر اُردو کی صورت مِل چکی تھی۔ خواجہ میر درد کے بھائی خواجہ میر اثر نے خواب و خیال کے نام سے اُردو میں جو مثنوی لکھی ہے' اس کی زبان کو انھوں نے ہندی ہی کہا ہے۔ غلام ہمدانی مصحفی نے اردو شاعروں کے حالات پر مشتمل جو تذکرہ نوابانِ اودھ کے زمانے میں لکھا تھا اس کا نام بھی انھوں نے تذکرہ ہندی گویاں رکھا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ جس زمانے میں اردو قدیم لبادہ اتار کر اُردوئے معلّیٰ کا طلائی لباس پہن چکی تھی یہ اس زمانے میں بھی ہندی کے نام سے معنون تھی۔ ایسی صورت میں اگر ہم ہندی کا نام اُردو کی ابتدائی شکلوں کے لیے مستعمل دیکھتے ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

قدیم صوفیائے چشت کے متعلق بھی جب ہم تاریخوں اور تذکروں میں ہندی دانی یا ہندی گوئی کا ذکر پڑھتے ہیں۔ تو اس سے مراد عربی فارسی آمیز وہی بھاشا ہوتی ہے جو اردو کی ابتدائی اور قدیم شکل کہی جاتی ہے وہ برصغیر کی جس مشترکہ یا علاقائی زبان کو بھی اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے استعمال میں لاتے تھے اس کے لیے انھوں نے دیوناگری کی بجائے عربی رسم الخط اختیار کیا ہے۔ اور اس طرح یہاں کی ہر زبان کو مسلمانی رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ دکنی، گوجری، ہریانوی، پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی، براہوی، تامل، تیلگو حتیٰ کہ بھاشا اور بنگالی کو بھی انھوں نے عربی رسم الخط دیا ہے یہ الگ بات ہے کہ بعد کے حالات نے ان میں سے چند کو پھر بے دین بنا دیا ہے عربی رسم الخط اختیار کرنے سے ایک طرف تو برصغیر کی مختلف زبانوں میں رسم الخطی ہم آہنگی اور مرکزیت پیدا ہو گئی اور دوسری طرف مختلف زبانیں عربی اور فارسی اثرات قبول کرنے کے زیادہ سے زیادہ قابل اور مناسب ہو گئیں۔ یہ اسی اثر قبولی کا نتیجہ تھا کہ پنجاب میں سکھی پنجابی سے' جو گورمکھی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی، مسلمانی پنجابی بالکل مختلف انداز رکھتی ہے اور واضح اسلامی اثرات لیے ہوئے دکھائی دیتی ہے۔ یہ

صورت حال دوسری زبانوں کو بھی پیش آئی ہے۔ زبانوں پر اس عمل ظاہری نے ان کے باطن میں بھی اسلامی اثرات پیدا کئے ہیں اور برصغیر کی مختلف علاقائی زبانوں کو الفاظ و معانی اور رموز و علائم کے اعتبار سے اسلام اور مسلمانی تہذیب و ثقافت اور عقائد کے قریب تر کیا ہے جس کے نتیجے کے طور پر اردو کی قدیم یا ابتدائی شکل کا پیدا ہو جانا ایک قدرتی اور لازمی امر تھا۔

صوفیا نے دراصل اپنی تبلیغ و تلقین کے ابتدائی زمانے ہی سے فارسی میں ہندی یا ہندی میں فارسی کی آمیزش شروع کر دی تھی بلکہ ہندی زبان میں کچھ نہ کچھ کہنا بھی شروع کر دیا تھا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے دادا شیخ سعد اللہ نے کبیر پنتھی فرقہ کے سربراہ بھگت کبیر کے متعلق جو رائے دی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ ہندی سمجھتے اور جانتے تھے[۱]۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنے ایک بزرگ رزق اللہؒ کی ہندی دانی کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار (فارسی) میں ایک مجذوب کا فقرہ "بھاکری پکا سکتے ہو" بھی لکھا ہے[۲]۔ اللہ دین نامی ایک اور مجذوب کے اردو نما فقرے بھی اس کتاب میں موجود ہیں[۳]۔ با ین مجذوب کا بھی ایک اردو لفظ لکھا ہے[۴]۔ شیخ جلال الدین قریشی کے متعلق شیخ محدث کہتے ہیں کہ ہندی، فارسی، عربی تینوں زبانوں میں گفتگو کر سکتے تھے[۵]۔ شیخ برہان الدین کالپی کے دوہوں کا بھی انھوں نے ذکر کیا ہے[۶]۔ شیخ محدث یہ بھی لکھتے ہیں کہ شیخ عبداللہ مجذوب (ابدال) ہندی دوہے بھی کہتے تھے[۷]۔ ملاّ

---

۱ : اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار ص ۴۹۵

۲ : اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار ص ۴۸۶

۳ : اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار ص ۴۸۵

۴ : اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار ص ۴۸۴ / ۴۸۳

۵ : اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار ص ۴۲۲ / ۴۷۵

۶ : اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار ص ۴۷۳

۷ : اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار ص ۴۸۲

نورالدین محمد ترخان شہنشاہ ہمایوں کا ہم راز اور ہم سخن مصاحب تھا۔ انہیں سفیدونی بھی کہتے تھے کیونکہ وہ سرہند کے قریب سفیدوں پرگنہ کا جاگیردار رہا ہے۔ فارسی کا شاعر تھا اور اس زبان میں اس نے ایک دیوان بھی مرتب کیا ہے اس نے دریائے جمنا سے ایک نہر کھدوائی تھی جو پچاس کوس تک کرنال بلکہ اس کے آگے تک جاتی تھی۔ اس کا نام اس نے شیخولئی رکھا تھا۔ لئی ہندی زبان میں نہر کو کہتے ہیں۔ یہ نام اس نے شہزادہ سلیم (پسر شہنشاہ اکبر المعروف بہ شیخو) کے نام پر رکھا تھا۔

شیخ برہان شہنشاہ اکبر کے زمانے میں مہدوی فرقہ کے ایک بزرگ تھے۔[1] ملا عبدالقادر بدایونی منتخب التواریخ میں کہتے ہیں کہ وہ تصوف پر ہندی میں شعر کہتے تھے۔ ملا خود بھی شاعر تھے اور نظام الدین امیٹھی والے کے شاگرد تھے۔ وہ ہندی داں تھے انہوں نے منتخب التواریخ (فارسی) کے آخر میں کتابوں کی جو فہرست دی ہے اس سے ان کی ہندی دانی کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے۔ قاضی یعقوب مانکپوری کے متعلق ملا بدایونی نے کہا ہے کہ عربی کے شعر ہندی بحروں میں کہا کرتے تھے[2]۔ منتخب التواریخ ہی سے پتہ چلتا ہے کہ عبدالقادر ملوک شاہ بدایونی نے ۹۹۹ھ کے اوائل میں شہنشاہ اکبر کے حکم سے تاریخ کاشمیر کا ہندی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔[3] منتخب التواریخ کا اردو میں ترجمہ کرنے والے نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے حاشیہ میں لکھا ہے کہ یہ ترجمہ ملا شاہ محمد شاہ آبادی نے کیا تھا۔ کالنجر کے راجہ نندی نے ایک قصیدہ ہندی زبان میں کہہ کر سلطان محمود غزنوی کو بھیجا تھا جس کے عوض سلطان نے اسے چند قلعوں کا حاکم مقرر کردیا تھا۔[4] شہنشاہ اکبر نے خواجہ حسین مروی کو سنگھاسن بتیسی (ہندی) کو فارسی میں منتقل کرنے کو کہا تھا۔[5] حاجی سلطان تھانیسری اکبری دور کے ایک عالم تھے انہوں نے رزم نامہ کے نام سے مہابھارت کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے[6] غیاث الدین علی، میر عبداللطیف قزوینی کا بیٹا تھا اس کے متعلق مولانا عبدالقادر بدایونی

---

[1] : منتخب التواریخ

[2] : منتخب التواریخ

[3] : منتخب التواریخ

[4] : منتخب التواریخ ص ۴۰

[5] : منتخب التواریخ ص ۶۶

[6] : منتخب التواریخ ص ۶۲۷

کہتے ہیں کہ وہ بادشاہ کو خلوت اور جلوت میں تاریخی قصّے، حکایات اور افسانے سنایا کرتا تھا جن کا ترجمہ ہندی زبان میں ہو چکا تھا۔

شیخ جمال دہلوی مصنف سیر العارفین کے متعلق مولانا بدایونی نے لکھا ہے کہ ان کی غزل جو ہندی بحر اور طرز میں ہے، وجد آور اور بڑی مشہور ہے سلطان سکندر لودھی کے متعلق بھی مولانا فرماتے ہیں کہ ہندی طرز میں شعر کہتے تھے اور گلرخ تخلص اختیار کیا تھا۔ مولانا داؤد نے لورک چندر کا قصہ ہندی زبان میں لکھا تھا۔ ملا عبد القادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں کہا ہے کہ یہ مثنوی بڑی مُوثر اور صاحبان ذوق کے لیے وجد آور ہے۔ ہندوستان کے گویے اسے بڑے مزے سے گاتے ہیں انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ مولانا داؤد اسے مسجد کے منبر پر (دورانِ وعظ) پڑھا کرتے تھے۔ ایک عالم نے ان سے پوچھا تھا کہ آپ منبر مسجد پہ یہ مثنوی کیوں پڑھتے ہیں۔ انھوں نے جواب میں کہا تھا اس لیے کہ اس کے سارے مطالب اہلِ تصوف کے اقوال اور آیاتِ قرآنی کے مطابق ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں صوفیائے کرام کو ہندی (ہندوی) اختیار کرنے میں مشکلات بھی پیش آئی ہیں اور بعض علمائے دینؒ نے اس زبان کے استعمال کو مناسب خیال نہ کرتے ہوتے اس عمل پہ اعتراض بھی کیا ہے لیکن یہ عمل رکا نہیں اور برابر جاری رہتے ہوتے آج ہندی (ہندوی) کی جدید شکل اُردو میں قرآن، حدیث، فقہ، تصوّف، دین، ادب، شعر، غرض کہ نظم و نثر کی ہر صنف اور موضوع کو آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ آج بھی اگر ہندی اختیاری پہ اعتراض ہے تو اس کے غیر اسلامی شناخت اور بت پرستانہ رجحانات معنوی لیے ہوتے دیوناگری رسم الخط پر ہے نہ کہ ہندی کے لفظ پر انگریز کے برصغیر پر قبضہ کے دوران یا آج بھی اگر ہندی اور اُردو کا تنازعہ ہے تو وہ اسی رسم الخطی اختلاف کی بنا پر تھا اور ہے اگر ہندی کا رسم الخط عربی ہو جائے تو جھگڑا ہی کوئی باقی نہیں رہتا۔

سید سلطان بنگال کے ایک صاحب دل ادیب گزرے ہیں۔ انھوں نے عہدِ اکبری میں عربی اور فارسی کی بجائے جب بنگالی کو تبلیغ و تلقین اور رسائل و کتب کے لیے استعمال کرنا

شروع کیا تو علما میں سے بعض نے انہیں منافق کہا اور یہ الزام لگایا کہ سید سلطان نے ہندی زبان میں دین کی باتیں لکھ کر دین کو ناپاک کر دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ علمار نے یہ اختلاف بنگالی کے دیوناگری رسم الخط کی بنا پر کیا ہے، جو واقعی مشرکانہ ہے۔ سید سلطان نے اس کے جواب میں کہا ہے کہ خدا کا ارشاد ہے کہ میں نے نبی بھیجا اس ملک کی زبان میں تعلیم دینے کے لیے جس میں وہ پیدا ہوئے ہیں وہ قولِ فیصل ہے جس کی بنا پر میں نے بنگالی کو دین کی تبلیغ و اشاعت کے لیے منتخب کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں اگر کوئی ایسا نہ کرے گا اور عربی اور فارسی نہ جاننے والوں کو ان کی اپنی زبان میں تعلیم نہ دے گا تو یہ بہت بڑا گناہ ہو گا۔ اگر پڑھے لکھے عام لوگوں کو تعلیم نہ دیں تو وہ بے چارے ضرور دوزخ میں جائیں گے اور اگر عام لوگ ناواقفیت کی وجہ سے گناہ کریں گے تو اللہ تعالیٰ اہلِ علم کو اس کا ذمہ دار سمجھے گا کیونکہ میں بھی ان میں سے ہوں اس لیے میں اہلِ علم کو صاف صاف کہتا ہوں کہ روزِ قیامت خدا کہے گا کہ تم لوگ اہلِ علم تھے تو تم نے لوگوں کو گناہ سے کیوں نہ روکا پس اہلِ علم روزِ قیامت اپنا فرض ادا نہ کرنے کے مجرم ٹھہریں گے۔ جب باری تعالیٰ لوگوں کے نیک و بد کا حساب کرے گا۔

یہ تھا وہ نظریہ جس نے سید سلطان اور دوسرے صوفیا کو مجبور کیا کہ وہ برّصغیر کے لوگوں کو ان کی اپنی زبان میں خطاب کریں۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو اس سے کیا نقصان ہوتا اس کا اندازہ سید سلطان ہی کے ایک اور بیان سے کیا جا سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ چونکہ بنگالی مسلمان عربی اور فارسی نہیں جانتے اور بنگالی میں اسلامی موضوعات پر کتابیں نہیں ہیں اس لیے ناچار مسلمان بھی ہندوؤں کی مذہبی کتابیں رامائن، مہابھارت وغیرہ پڑھتے ہیں۔ اس صورت حال کی اصلاح کے لیے میں بنگالی میں اپنی کتابیں لکھ رہا ہوں علما اسے ناپسند کرتے ہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ میرا فرض ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔ اگر سید سلطان اور ان کے ہم خیال دوسرے بنگالی صوفیا بنگالی میں کوئی مذہبی ادب پیدا نہ کرتے تو مسلمان ہندوانہ کتابیں ہی پڑھتے رہتے۔ ایسی صورت میں مسلمانوں خصوصاً نومسلموں کو جو نقصان پہنچتا وہ بیان سے باہر ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے بعض علماء

کی بنگالی میں کتابیں تحریر کرنے کی مخالفت زیادہ تر بنگالی کے اس رسم الخط کی بنا پر ہو گی جو دیوناگری ہے۔ اگر یہ بنگالی عربی رسم الخط میں ہوتی تو شاید اتنی مخالفت نہ ہوتی اور ان صوفیا کا دیوناگری رسم الخط اختیار کرنا ان کی مجبوری تھا کیوں کہ اس وقت یہی رائج تھا البتہ بعد کے صوفیا نے دیوناگری کی بجائے عربی رسم الخط ضرور اختیار کیا ہے۔

ایک دفعہ جب بنگالی میں مذہبی ادب تحریر کرنے کی تحریک چلی تو اس میں اتنا ممتاز اور قابلِ قدر ذخیرہ جمع ہو گیا کہ اسے "پوتھی ادب" کے نام سے بنگالی میں ایک مستقل دبستان کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس میں بنگال کے پنڈوی مرکز کے صوفیائے چشت کا بھی حصہ ہے۔ شیخ علاالحق لاہوری پنڈوی، شیخ نورالحق نور پنڈوی اور شیخ انوارالحق پنڈوی کے ملفوظات اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ یہ وہ بزرگ ہیں جنھوں نے عربی فارسی الفاظ کی وسیع اور موثر آمیزش سے بنگالی کو اُردو کے قریب تر کیا ہے اور رسم الخط کو بھی۔ رسم الخط کی اس تبدیلی نے سکھی پنجابی کو مسلمانی پنجابی بنانے کی طرز پر ہندوانہ بنگالی کو مسلمانی بنگالی بنا دیا۔ یہ ان کا ایک ایسا اجتہادی قدم تھا اگر اس کے بعد بھی باقاعدگی سے اٹھتا رہتا تو آج پاکستان کا مشرقی اور مغربی بازو رسم الخطی اتحاد میں بھی منسلک ہوتا۔

معلوم ہوتا ہے ہندی اختیاری کے خلاف آواز اس وقت بھی اٹھی تھی جب صوفیائے چشت نے جنوبی ہند میں تبلیغ و تلقین کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ شاہ میراں جی شمس العشاق چشتیؒ حضرت نظام الدین اولیاء چشتیؒ کے سلسلے کے بزرگوں میں سے ایک عظیم بزرگ ہوئے ہیں جنھوں نے خواجہ بندہ نواز گیسو دراز چشتیؒ کے قریبی زمانے اور دکن کے بہمنی سلاطین کے عہد میں مکہ سے آکر چشتیہ سلسلے کو جنوبی ہند میں فروغ دیا تھا۔ انھوں نے خود کہا ہے کہ میرا مولد مکہ شریف ہے۔ میں نے بارہ سال کے قریب مدینہ منورہ میں آستانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی گزارے ہیں جن دنوں میں مدینہ منورہ میں تھا شب جمعہ کو ایک دفعہ مجھے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی۔ انھوں نے مجھے ہندوستان کی طرف جانے کا حکم دیا۔ میں نے عرض کی میں ہندوستان کی زبان نہیں جانتا اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمھیں ساری زبان معلوم ہو جائے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ فیضِ ربانی اور نگاہِ رسالت

سے شاہ میراں جی شمس العشاقؒ کو ہندی زبان پر عبور حاصل ہوا اور اس میں انھوں نے کئی منظوم اور نثری تصانیف پیدا کی ہیں۔ اگر ہندی (مقامی زبان) اختیار کرنا گناہ ہی کی بات ہوتی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شاہ میراں جی شمس العشاقؒ کو اسے اختیار کرنے اور اپنی نگاہِ معجز اثر سے انہیں سکھانے کا عمل نہ کرتے۔ شاہ صاحب نے اس زبان کو کسی سے سیکھا پڑھا نہیں بلکہ یہ انہیں بلا پڑھے لکھے فیضان رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے از خود آگئی۔

صوفیائے چشت نے اس غلط فہمی کو خاص طور پر دور کیا ہے اور یہ بات زور دے کر کہی ہے کہ کسی ملک یا کسی قوم کی زبان میں خواہ اس ملک یا قوم کا مذہب کچھ ہو دین کی باتیں بیان کرنا غلط نہیں ہے بلکہ عین فطرت اور قرآن کے نظریہ کے مطابق ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے عربی میں قرآن نازل کرنے کی وجہ یہی بتائی ہے کہ جس قوم پر قرآن نازل کیا جارہا ہے اس کی زبان عربی ہے۔ چنانچہ شاہ میراں جی شمس العشاق چشتیؒ بھی کہتے ہیں کہ بہت سے لوگ ہیں جو عربی فارسی سے ناواقف ہیں۔ ان کے لیے ہندی میں (یعنی جنوبی ہند کی مقامی زبان میں) یہ باتیں لکھی گئی ہیں ظاہر پر نہ جانا چاہیے باطن کو دیکھنا چاہیے۔ زبان کوئی بھی ہو معنوں پر خیال کرنا چاہیے۔ جیسے مٹی چھان کر سونا نکالتے ہیں۔ اسی طرح بات کے مغز کو لو۔ اور لفظوں پر خیال نہ کرو۔ شاہ میراں جی شمس العشاق چشتیؒ نے یہ باتیں اپنی ہندی نظموں میں کی ہیں اور یہ بھی کہا ہے کہ "ہندی گھر بھا کا ہے۔ یعنی وہ زبان جو گھورے یعنی اُپلوں کے ڈھیر پر ہو۔ کہتے ہیں سمجھ لو کہ گھورے پر بارش ہوئی اور وہاں کسی کو چمکتا ہوا ہیرا مل گیا۔ یہ زبان گویا گھورے کا ہیرا ہے۔ کوئی عقل مند آدمی ایسے ہیرے کو گندہ سمجھ کر پھینک نہیں دے گا۔"

شاہ برہان الدین جانم چشتی، شاہ میراں جی شمس العشاقؒ کے فرزند اور خلیفہ تھے۔ انھوں نے بھی ہندی کے متعلق اپنی ایک نظم میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے فرماتے ہیں کہ ظاہر پر نہ جاؤ۔ باطن کو دیکھو۔ لفظوں کو نہ دیکھو معنی پر خیال کرو۔ ہندی لفظوں میں کوئی عیب اور خرابی نہیں۔ اگر سمندر کے موتی کسی جوہڑ میں ملیں تو عقل مند انہیں کیوں نہ لے۔

بعض علماء کی مخالفت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جب صوفیائے چشت نے برصغیر کی مختلف

علاقائی زبانوں میں کافروں کے لیے دعوتِ اسلام، نومسلموں کے واسطے تربیت اور مسلمانوں کے لیے اصلاحِ احوال کا کام شروع کیا تو اس سے جہاں دین کے حق میں خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے مختلف زبانوں کے امتزاج سے ابھرنے والی ایک نئی زبان کی تشکیل میں بھی مدد ملی جو بعد میں اُردو کے نام سے موسوم ہوئی۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ صوفیائے چشت نے عربی اور فارسی کو خیرباد کہہ دیا تھا بلکہ معاملہ صرف خاص و عام میں تمیز کا تھا۔ اہلِ علم عربی شناس اور فارسی دانوں کے لیے انھوں نے عربی اور فارسی ہی کو تحریر کی زبان رکھا ہے۔ ہندی اختیاری کا عمل صرف عربی فارسی سے ناواقف مسلمانوں ، نومسلموں اور کافروں کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔

بزرگانِ چشت نے برصغیر میں تبلیغ و تلقین کے ابتدائی زمانے میں اظہار بیان کے جن سانچوں کو استعمال کیا ہے وہ خطبہ، مکتوب، ملفوظ، قول، رسالہ، شاعری، موسیقی وغیرہ تھے۔

خطبہ کسی مجمع میں زبانی خطاب کا نام ہے چاہے وہ مجمع عام ہو یا خاص۔ لیکن جب کوئی خطبہ تحریری شکل اختیار کرتا ہے تو اس کے مخاطب پڑھے لکھے لوگ ہو جاتے ہیں۔ اسے نثر کی ایک قسم سمجھنا چاہیے جسے ہم کسی خاص موضوع تک محدود نہیں رکھ سکتے۔ اگرچہ صوفیائے قدیم کے تحریری خطبات دستیاب نہیں ہوئے۔ لیکن اس بات کا قوی امکان ہے کہ انھوں نے جمعہ کے اجتماعات یا دوسرے مخصوص جلسوں میں زبانی خطبات ضرور دیے ہوں گے اور ان کی زبان اگر مکمل طور پر نہیں تو جزوی طور پر ضرور ہندی آمیز ہو گی۔ لیکن افسوس ہے کہ ہم اس وقت اس کی تحریری شکل کی شہادت مہیا کرنے سے قاصر ہیں۔

مکتوب نگاری نثر کی ایک قسم ہے اور اس کی حیثیت ان خطوط سے جو عام طور پر نجی حالات و معاملات کے بارے میں عزیز و اقارب اور دوست آشنا ایک دوسرے کو لکھتے ہیں، مختلف ہوتی ہے۔ مکتوبات کا موضوع کوئی نہ کوئی علمی مسئلہ، دینی بحث، صوفیانہ رمز، عارفانہ سِر، فلسفیانہ نکتہ یا ادبی بات ہوتی ہے اور یہ عموماً کسی عالم، فاضل، صوفی، فلسفی، یا ادیب کی طرف سے کسی دوسرے ہم مرتبہ، ہم مشرب، معاملہ فہم یا سخن سنج شخص کے لیے لکھے جاتے ہیں۔ قدیم صوفیائے چشت کے جو مکتوبات اب تک سامنے آئے ہیں وہ اسی لیے فارسی اور عربی آمیز فارسی میں ہیں۔ البتہ ان کے درمیان بعض ہندی الفاظ یا دوہے نظر آجاتے

ہوں تو الگ بات ہے چشتیہ بزرگوں کے فارسی مکاتیب کے سلسلے میں شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ، شیخ جلال الدین تھانیسریؒ اور شیخ گنگوہی کے فرزند و خلیفہ شیخ رکن الدینؒ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

ملفوظ اور قول البتہ خطبہ اور مکتوب کے مقابلے میں عوامی چیز ہے۔ ان کا خطاب بلاتخصیص ہر شخص اور ہر محفل سے ہوسکتا ہے۔ ملفوظات کسی عالم یا بزرگ کی ان باتوں پر مشتمل ہوتے ہیں جو وہ مجلس میں پہلے سے سوچے سمجھے موضوع کے بغیر فی البدیہہ کرتے ہیں۔ یہ باتیں کسی ایک مخصوص موضوع پر بھی ہوسکتی ہیں اور متفرق و متنوع موضوعات پر بھی۔ یہ کسی بزرگ یا عالم کی ایسی نجی گفتگو ہوتی ہے جو تبلیغ و تلقین اور پند و نصائح لیے ہوتی ہے۔ مردانِ حق آگاہ کی ایسی باتیں چونکہ سنجیدہ، ثقہ، نصیحت آموز اور راہنما ہوتی ہیں۔ اس لیے وہ اس قابل سمجھی جاتی ہیں کہ ان کو تحریری شکل میں محفوظ کرلیا جائے۔ چنانچہ اس کا انداز صوفیائے چشت کے سلسلے میں عام طور پر یوں رہا ہے کہ ایک بزرگ کی مجلسی باتوں کو ان کا کوئی معتبر اور برگزیدہ مرید قلم بند کر دیتا تھا۔ اس قسم کے ملفوظات، ملفوظات چشت اہلِ بہشت یا ہشت بہشت کے نام سے ملتے ہیں۔ یہ مجموعہ ہائے ملفوظات چونکہ ایک بزرگ کی طرف سے دوسرے بزرگ کی باتوں پر مشتمل ہونے کے سوا اور کچھ نہیں۔ اسی لیے بعض لوگ ان کو صوفیائے چشت کی تصانیف شمار نہیں کرتے۔ اگر اس اعتبار سے ان کو دیکھا جائے تو یہ درست ہے۔ یہ محض ایک بزرگ کی مجلسی باتوں کو خاص انداز میں مرتب کر کے رسالے یا کتاب کی صورت دینے کا ایک عمل ہے۔ یہ ملفوظاتی رسالے اور کتابیں فارسی میں ہیں لیکن ان میں کہیں کہیں قدیم اُردو کے جملے اور الفاظ بھی نظر آجاتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ مجلسی باتیں حاضرین کی زبان دانی اور موضوع کی مناسبت سے کلی یا جزوی طور پر اس وقت کی قدیم اُردو ہی میں ہوں اور مرتب کنندوں نے ان کو فارسی زبان میں مرتب کر دیا ہو کیونکہ اس وقت نثر و نظم کی زبان یہی تھی۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار میں اپنے مرشد شیخ علی متقیؒ کے بارے میں لکھا ہے[1] کہ وہ ہر شخص

---

[1] زاد المتقین فی سلوک طریق الیقین از شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور اخبار الاخیار ذکر شاہ منصور مجذوب، ص ۵۸۰

کے ساتھ اس کی زبان میں گفتگو کرتے تھے چنانچہ ہندوؤں کے ساتھ بات چیت میں وہ ہندی اپنا لیتے تھے۔ اس مثال سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ دوسرے بزرگ اور صوفیا بھی اس پر عمل پیرا ہوتے ہوں گے اور صوفیائے چشت نے فارسی نہ جاننے والوں کے ساتھ فارسی میں نہیں مقامی زبان یا قدیم اردو ہی میں بات کی ہو گی جسے مرتب کنندگان نے اس وقت کے لسانی رجحان کے تحت فارسی میں قلم بند کر دیا ہو گا۔

جنوبی ہندوستان میں البتہ صوفیائے چشت نے نثری کتابوں کے لیے دکنی اور گوجری زبانوں کو جو اُردو کی قدیم صورتیں ہی ہیں کو استعمال کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شمال کے برعکس وہاں مقامی زبانوں کو شاہی سرپرستی حاصل ہو چکی تھی۔ اس سلسلے میں شیخ عین الدین گنج العلم اور خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے رسائل دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس رجحان کی بنا پر وہاں بعض کتابیں ایسی مرتب کی گئی ہیں کہ ان کے ملفوظات مکمل طور پر اپنی اصل شکل یعنی مقامی زبان (ہندی) میں جمع کر دیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر شیخ وجیہہ الدین گجراتی کے ملفوظات کا مجموعہ دیکھئے جو ان کے مریدوں نے بحرالحقائق کے نام سے جمع کیا ہے۔ اس کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ شیخ کے مرید ان سے جو سوال کرتے تھے شیخ ان کے جواب ہندی (مقامی زبان) میں دیتے تھے۔ چنانچہ بحرالحقائق کا انداز یہی ہے کہ اس میں سوال فارسی میں ہے اور جواب ہندی میں[1] اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صوفیائے چشت کی محافل میں بھی غیر مسلموں اور فارسی ان پڑھ مسلمانوں کے لیے یہی انداز اختیار کیا جاتا ہو گا اور ان کے اصلی ہندی ملفوظات ان سے بہت زیادہ ہوں گے جو ان کے ملفوظات پر مشتمل مجموعوں میں ملتے ہیں۔

قول بھی ملفوظ ہی کی ایک صورت ہوتی ہے لیکن یہ کسی ایسی بات پر مشتمل ہوتا ہے جو ایک آفاقی صداقت اور ضرب المثلی سچائی کی حیثیت رکھتا ہو۔ صوفیاء کے ملفوظات میں سے وہ باتیں جو ہر دور اور ہر ملک و ملت کے لوگوں کے سامنے ایک حقیقت کبریٰ اور صداقتِ آفاقی کے طور پر پیش کی جا سکتی ہیں قول کہلاتی ہیں ۔ قول عام طور پر ایک آدھ جملے پر

---

[1]: اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام از مولوی عبدالحق ص ۳۷ / ۳۸

مشتمل ہوتا ہے مثال کے طور پر حضرت شیخ محمد غوث گوالیاریؒ کا یہ کہنا کہ "بھیکی بچہ خدا کو نہ میلے" ایک قول ہے۔ لیکن شاہ وجیہہ الدین علویؒ کا یہ کہنا کہ "میں کدھاں ریاضت کیتی" ایک ملفوظ ہے۔ یہ محض ایک بات ہے لیکن پہلے جملہ میں ایک آفاقی صداقت ہے اس لیے وہ قول ہے بزرگان چشت کی کتب ملفوظات میں اس قسم کے قول ہندی زبان میں کئی جگہ دکھائی دیتے ہیں۔ شیخ باجنؒ نے جو آٹھویں صدی ہجری کے ایک مشہور چشتیہ بزرگ ہیں اپنی کتاب آیۂ رحمت میں باوا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ کے بعض ہندی اقوال درج کیے ہیں جن کا ذکر آگے آئے گا۔

رسائل کی شکل میں صوفیائے چشت نے عرفان و مذہب کے مضامین و مباحث پر ہندی (مقامی زبانوں) میں جو کچھ لکھا ہے اس کا تعلق زیادہ تر دکنی اور گوجری زبانوں سے ہے۔ یہ رسائل نثر میں بھی ہیں اور نظم میں بھی۔ ان کا وجود اس زمانے سے ملتا ہے جب سید بندہ نواز گیسو درازؒ اور ان کے خلفاء و مریدین نے جنوبی ہند میں اشاعت دین کا کام شروع کیا تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب مرکز سے الگ ہو کر جنوب میں بہمنی سلطنت کی بنیاد رکھی گئی تھی اور اس کے بعد قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنتوں کا عروج ہوا تھا۔ مختصر رسائل کے ساتھ ساتھ اس دور کے صوفیائے چشت نے دکنی اور گوجری زبانوں میں باقاعدہ کتابیں بھی تصنیف کی ہیں سید بندہ نواز گیسو درازؒ کی تصنیف معراج العاشقین اسی سلسلے کی ایک کتاب ہے۔ اس کی زبان دکنی ہے جو جنوب کی زبانوں تلیگو، کنڑی، تامل، وغیرہ پر شمال سے آنے والے مسلمان فاتحین اور آباد کاروں کے لسانی اثرات کے تحت معرض وجود میں آئی تھی۔ فرشتہ نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے یہ سلطنت بہمنیہ اور اس کے بعد قطب شاہی اور عادل شاہی حکومتوں کی سرکاری زبان تھی۔ اسی لیے ان خاندانوں کے بعض بادشاہ مثلاً سلطان محمد قلی قطب شاہ، سلطان عبداللہ قطب شاہ، سلطان محمد قطب شاہ اور سلطان علی عادل ثانی دکنی زبان کے بلند پایہ شاعر بھی تھے ان میں سے بعض نے تو دکنی میں باقاعدہ کلیات بھی مرتب کیے ہیں اور اپنی سرپرستی میں دکنی زبان کا بہت بڑا ذخیرہ بھی جمع کیا ہے۔ یہ زبان اُردو ہی کی قدیم شکل یا سایہ ہے۔

گوجری بھی تھوڑے بہت فرق کے ساتھ دکنی ہی ہے جنوبی ہند کے صوفیائے چشت

نے اس زبان کو بھی اس کی سرکاری اور عوامی حیثیت کے پیشِ نظر اپنی شاعری اور تصانیف کی زبان فارسی و عربی کے ساتھ ساتھ گوجری بھی رکھی ہے۔ دراصل مقامی زبان (یعنی دکنی اور گوجری) میں جتنا تحریری سرمایہ بزرگانِ چشت نے نظم و نثر کی صورت میں جنوبی ہند میں پیدا کیا ہے اردو کی کسی اور قدیمی شکل میں نہیں کیا۔ شیخ عین الدین گنج العلمؒ، سید بندہ نواز گیسو درازؒ، شاہ میراں جی شمس العشاقؒ، شاہ امین الدین اعلیٰؒ، شاہ برہان الدین جانمؒ، شیخ خوب محمد چشتیؒ اور دوسرے کئی چشتیہ بزرگ اسی دور اور اسی علاقے کی زبان کے مصنف ہیں۔
شاعری کے سلسلے میں صوفیائے چشت کی تخصیص یہ ہے کہ انھوں نے ہندی میں فارسی اصناف اور بحروں کو بہت کم استعمال کیا ہے۔ مثنوی اور کسی حد تک غزل کے سوا انھوں نے دوسری فارسی اصناف کو اظہارِ خیال کا بہت کم ذریعہ بنایا ہے۔ ان کا زیادہ رجحان ہندی شاعری کی بحروں کی طرف رہا ہے اور انھوں نے اپنی شاعری کو ہندی پنگل کے تابع رکھا ہے اس کی وجہ محض یہ تھی کہ برصغیر کے عوام عربی فارسی سے ناواقف تھے۔ شاعری سے صوفیائے چشت کا مقصد تفریح طبع نہیں تھا بلکہ دین اور نصائح کا عوام تک ابلاغ تھا اس لیے انھوں نے عوام پسند اور عوام شناس زبان اور بحروں کو عربی فارسی اور ان کی بحور کے مقابلے میں ترجیح دی ہے۔ ہندی شاعری اور بحروں کی صفت یہ ہے کہ یہ کسی نہ کسی راگ اور راگنی کے تابع ہوتی ہیں۔ اس لیے موسیقی اور ہندی شاعری میں چولی دامن کا ساتھ پیدا ہو گیا ہے۔ صوفیائے چشت کے سلسلے میں جب ہم موسیقی دانی کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ کوئی سازندے تھے یا اہلِ نشاط میں سے تھے بلکہ مقصود یہ ہے کہ انھوں نے شاعری کو موسیقی کی راگ راگنیوں میں باندھا ہے جس کی ضرورت اس لیے محسوس کی گئی تھی کہ ہندوؤں کے لیے موسیقی کے ذریعے جو ان کی زندگی اور مذہب کا جز تھی صوفیانہ خیالات اور عارفانہ باتوں کی طرف توجہ کا موقع پیدا کیا جائے۔
چنانچہ یہ تجربہ بڑا کامیاب رہا اور مسلمان صوفیا نے جب اپنی مجالس سماع میں ہندی موسیقی یعنی ہندی راگ راگنیوں کو رائج کیا اور اپنی تبلیغی نظموں اور تلقینی شاعری میں بھی انہیں جگہ دی تو ہندو عوام نے نہ صرف ان کی طرف بڑے شوق سے توجہ کی بلکہ مذہبی اثرات

بھی قبول گئے، جس سے تبلیغ دین کی راہ ہموار ہوئی اور اسلام اور اس کے نام کو فروغ حاصل ہوا۔

خواجہ بندہ نواز گیسو دراز بہت بڑے عالم اور عظیم چشتی صوفی تھے۔ انھوں نے بھی اسی لیے اپنی شاعری کو راگنیوں کے تابع رکھا تاکہ عوام خصوصاً ہندوؤں کے لیے اس میں کشش پیدا ہو۔ سلطان ابراہیم عادل شاہ کی (جو خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سے عقیدت رکھتے تھے) تصنیف نورس دیکھیے اس میں انھوں نے راگ بھیرو، ابھوک، رہس وغیرہ کے تحت ہندی شعر لکھے ہیں۔

شیخ بہاالدین برناوی چشتی نے جنہیں امیر خسرو کی طرح موسیقی سے عشق کی حد تک لگاؤ تھا۔ جکری خیال، چٹکلہ، قول، ترانہ، سادرہ، دھرپد کے راگ راگنیوں کے تحت ہندی شعر کہے ہیں اور ان سے بارش برسنے، بارش بند کرنے، مرض سے شفا پانے، مرشد کی زیارت اور خضر سے ملاقات تک کے کام لیے ہیں۔ ساز خیال اور ساز کھڑس راگوں کو بھی انھوں نے ہی ایجاد کیا تھا۔ راگ کلپادرم کے نام سے سری کرشنا نند ویاس دیو نے انیسویں صدی میں اٹھارہ سو صفحات پر مشتمل ہندی گیتوں اور راگوں کا ایک مجموعہ مرتب کیا ہے جس پر شاہ دہلی نے انہیں راگ ساگر کا خطاب بھی دیا تھا۔ اس میں ہزاروں شعر راگ، گیت، بہار، ہولی، دھرپد خیال، ریختہ وغیرہ انواع موسیقی کے تحت جمع کیے گئے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ برصغیر میں ہندی شاعری کو موسیقی کے تابع رکھنے کا رجحان کس قدر بنیادی اور اصولی تھا۔ ہمارے قدیم صوفیائے چشت نے اس رجحان کے پیش نظر اپنی شاعری کو ہندی موسیقی کی مختلف انواع میں بند کر دیا ہے۔

خواجہ محمد چشتی، مولانا بدرالدین اسحٰق چشتی کے بیٹے اور بابا فریدالدین گنج شکر کے نواسے تھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار میں لکھا ہے کہ موسیقی میں انھیں کمال حاصل تھا[1]۔ سید محمد بن جعفر مکی حسینی چشتیہ سلسلے میں حضرت نصیرالدین چراغ دہلوی کے مرید تھے۔ قوالی ان کی روح کی غذا تھی اور وہ ہندی موسیقی کے ماہر تھے۔ شیخ محدث نے ان کے بسنت راگ کا بھی ذکر کیا ہے۔ بابا فریدالدین گنج شکر کی سماع سے رغبت، خواجہ قطب الدین

---

[1] : اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار، ص ۱۷۶۔

بختیار کعکیؒ د کاکی) کا اس میں والہانہ استغراق اور حضرت امیر خسروؒ کی راگ راگنیوں سے نسبت خاص کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں شیخ علا الدین چشتیؒ کے متعلق شیخ محدث کہتے ہیں کہ ہندوستانی فن موسیقی میں ماہر تھے اور شاعری بھی کرتے تھے[۱]۔ شاہ بھیک چشتیؒ کے ذوق سماع کی بات بھی تذکرہ نگاروں نے خاص طور پہ کی ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے اپنی تصنیف مقدمہ شعر و شاعری میں ان کے مرید نواب روشن الدولہ کے گھر پر راگ راگنی کی ایک محفل کا ذکر کیا ہے جس میں عمر خیام کی ایک رباعی سن کر شاہ بھیکؒ گھنٹوں تڑپتے رہے تھے۔ حضرت خوب محمد چشتیؒ کی چھپن چھند اں میں موسیقی کی بحروں کا ذکر بھی ہے اور ان کا استعمال بھی۔ حضرت حمید الدین ناگوریؒ حضرت نظام الدین اولیاؒ، شیخ محمد غوث گوالیاریؒ، شیخ سلیم چشتیؒ، باوا فرید الدین گنج شکرؒ، قطب الدین بختیار کعکیؒ اور حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ کے سماع سننے اور اس سے رغبت کا ذکر بھی ملتا ہے۔

حافظ محمود شیرانی نے شیخ بہا الدین برناوی چشتیؒ کے فنِ موسیقی سے رغبت کے ساتھ اس فن میں ان کی ایجادات کا بھی ذکر کیا ہے[۲]۔ مولوی عبدالحق نے قاضی محمود دریائیؒ بیر پوری کی موسیقی کی بحروں کا حال لکھا ہے[۳]۔ خواجہ بہا الدین زکریا ملتانی اگرچہ سہروردی سلسلہ سے تعلق رکھتے تھے لیکن باوا فرید الدین گنج شکرؒ اور دوسرے صوفیائے چشت کے ہم جلیس وانیس تھے موسیقی سے ان کا بھی بڑا لگاؤ تھا۔ حافظ محمود شیرانی نے موسیقی میں ان کی ایجادات کا ذکر بھی کتاب "پنجاب میں اردو" میں کیا ہے[۴]۔ باوا فرید الدین گنج شکرؒ کو ملتان کی سہروردی خانقاہ سے ابتدائی زندگی میں گہرا تعلق رہا ہے۔ شاید اس لیے ملا عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں انہیں شیخ بہا الدین زکریاؒ ملتانی کا مرید

---

[۱]۔ اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار، ص ۳۹

[۲]: پنجاب میں اردو، ص ۵۹

[۳]، اردوئے قدیم میں صوفیائے کرام کا کام، ص ۹۷

[۴]، پنجاب میں اردو، ص ۵۸

لکھ دیا ہے[1] حالانکہ مرید وہ خواجہ قطب الدین بختیار کعکیؒ (کاکی) کے ہیں جو خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کے خلیفہ تھے۔ سید علا الدین چشتیؒ کے متعلق شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے بھی لکھا ہے کہ ہندوستانی موسیقی میں ماہر تھے[2]

صوفیائے چشت کے موسیقی اختیار کرنے سے اس کا نفوذ مسلمانوں کے معاشرہ میں وسیع پیمانے پر ہو گیا۔ درباروں، خانقاہوں، تکیوں، دواروں میں غرض کہ ہر جگہ۔ لیکن اس فرق کے ساتھ کہ کہیں "یہ سماع راست" رہا جس کے متعلق مولانا رومؒ نے کہا ہے

کہ بر سماع راست ہر کس چیر نیست
طعمۂ ہر مرغکے انجیر نیست

اور کہیں کج۔ کہیں روح کی اشتعالک کا سبب بنا اور کہیں عیش و عشرت کا۔

بعض لوگ لفظ موسیقی خصوصاً صوفیا سے اس کے تعلق پر کان کھڑے کرتے ہیں۔ محض اس لیے کہ وہ اسے ساز و آواز کی تفریح ہی سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے صوفیائے کرام کے ضمن میں جب ہم موسیقی کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے مراد یہ نہیں کہ ان کے ہاں میراثیوں کے مجمعوں اور طوائفوں کے کوٹھوں کی طرح کی کوئی محفل برپا ہوا کرتی تھی بلکہ مراد یہ ہے کہ شاعری میں موسم، وقت، حالت، کیفیت وغیرہ کے مطابق اثر پذیر ہونے والی۔ ایسی راگنیوں اور راگوں کو اختیار کیا جاتا تھا جن سے سننے والوں کی روح کو تحریک ملے اور ان میں روحانی جذبات مشتعل ہوں۔ نہ یہ کہ ان سے نفسانی جذبات کو اشتعالک ہو دنیا داروں اور صوفیا کی موسیقی میں یہی فرق ہے۔

شہنشاہ اکبر کے دور میں تان سین کی موسیقی اور شیخ سلیم چشتیؒ کی خانقاہ پر موسیقی میں

---

[1] منتخب التواریخ، ص ۷۶

[2] اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار، ص ۳۹۷

واضح فرق تھا ایک اسی فرق کی بنا پر محفل موسیقی تھی اور دوسری محفل سماع ۔ قنوج کے قریب بلگرام ایک قصبہ ہے جہاں بڑے بڑے عالم، فاضل صوفی اور شاعر ہوئے ہیں[1]۔ ان میں سے بعض کے ہاں محافل موسیقی منعقد ہوتی تھیں۔ ان میں شیخ عبدالواحد بلگرامی ایک فاضل بزرگ تھے جو موسیقی کے ماہر خیال کیے جاتے تھے۔ ملّا عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں لکھا ہے کہ وہ ہندی راگ گایا کرتے تھے[2]۔ یہی مولف لکھتا ہے کہ زین خان کوکہ ہندی ساز اور دف کے بجانے میں اور موسیقی کی تمام قسموں میں بے مثل ماہر اور یکتائے روزگار تھا[3]۔ چغتائی امیروں میں سے خنجر بیگ کے متعلق یہی مولف کہتا ہے کہ "وہ[4] فارسی اور ہندی راگ راگنیوں کا بڑا ماہر تھا۔ موسیقی میں اس کے مقابل کوئی نہیں تھا اس کو ایسے راگوں کا علم تھا جو بلند مرتبہ سلاطین و امرا کی محافل میں بھی سننے میں نہیں آئے اور اس زمانے میں تو ان کا نام و نشان بھی نہیں رہا۔ ان دونوں قسم کی محافل میں یعنی امرا کی محافل موسیقی اور صوفیا کی محافل سماع میں جو فرق ہو سکتا ہے وہ وہی ہے جو نفسانی اثر انگیزی اور روحانی کیف آوری میں ہوتا ہے۔

صوفیائے چشت اور دوسرے سلسلے کے صوفیا نے جب ہندی موسیقی کی لحروں اور راگ راگنیوں کو اپنی شاعری کے لیے استعمال کیا تو اس سے فارسی کے ساتھ ساتھ ہندی/ ہندوی (قدیم اُردو) کے رواج پانے میں بڑی مدد ملی۔ انھوں نے ہندی شاعری کی جس صنف کو اپنے خیالات وجذبات کے اظہار کا ذریعہ بنانے میں سب سے زیادہ اہمیت دی ہے وہ دوہہ ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ صوفیا کے حریف گورکھ پنتھی اور بدھ سدھو بھی عوام پر اثر انداز ہونے کے لیے اپ بھرنش ملی ہوئی دیش بھاشا میں زیادہ دوہے ہی لکھا کرتے تھے۔ اس زمانے میں جس طرح لفظ گاتھا سے مراد پراکرت ہوتی تھی

---

[1] دیکھیے خزانہ عامرہ اور سرو آزاد از آزاد بلگرامی

[2] منتخب التواریخ، ص ۵۹۷

[3] منتخب التواریخ، ص ۶۹۵

[4] منتخب التواریخ، ص ۶۸۸

وہے سے رائج الوقت زبان کا مفہوم بھی لیا جاتا تھا۔ بدھ سدھو مشرقی ہندوستان میں
اور گورکھ ناتھ پنتھی جوگی راجپوتانہ اور پنجاب کے علاقوں میں اپنے استدراج دکھاتے
اور دوہے گاتے پھرتے تھے صوفیائے چشت نے ان دوہوں کا رُخ اوتاروں سے خدا
اور کفر سے اسلام کی طرف پھیر دیا۔

ہیئت کے اعتبار سے ہندی دوہہ عربی کی ایک بیت، فارسی کے ایک شعر یا اُردو
کے ایک فرد کے مترادف ہے۔ دوہہ بنیادی طور پہ ایک شعر یعنی دو مصرعوں پر مشتمل ہوتا
ہے۔ لیکن ہندی میں یہ محض ایک حاشیہ کی چیز نہیں بلکہ شاعری کی ایک مستقل اور مقبولِ عام
صنف ہے جو ہندی موسیقی کے تابع ہے۔ بیت کی طرح اگرچہ دوہے میں بھی دو ہم قافیہ
مصرعے ہوتے ہیں لیکن اس میں ہر مصرعہ کئی حصّوں میں تقسیم ہوتا ہے جسے چرن یا پد
کہتے ہیں۔ پنجابی میں بھی دوہہ چار مصرعوں کا ہوتا ہے۔ اس دوہے نے پنجابی میں سی حرفی اور کافی کی شکلیں اختیار
کر لی ہیں۔ سی حرفی نظم کی وہ قسم ہے جس میں دوہے یا چومصرعی بند الفبائی اعتبار سے
حروف ابجد سے شروع ہوتے ہیں۔ سی حرفی کے ہر دو شعروں کو الگ الگ پڑھا جائے
تو یہ ٹکڑا بیت کہلاتا ہے۔ پنجاب اور سندھ میں کافیوں کو بھی دوہوں کے مختلف
بندوں میں دہرایا جاتا ہے۔ کافی ایک مکمل نظم ہوتی ہے جس کا ٹیپ کا مصرع پلٹ
پلٹ کر آتا ہے۔ علم موسیقی میں کافی ایک راگ بھی ہے جو سمپورن ہے۔ کافی ٹھاٹھ بھی
ہے۔ اس سے کئی مشہور راگ نکلتے ہیں مثلاً بھیم پلاسی، پیلو، برد یپکی، باگیری،
بہار، اڈانہ، بروا، کانڑا وغیرہ۔ سورٹھ بھی دوہہ ہی کا ایک رُخ ہے۔ یہ ہندی
شاعری کی ایک بحر بھی ہے اور راگ کی قسم بھی۔ اس میں قافیہ شعر کے درمیان آتا ہے
اور عجب لطف دیتا ہے۔ نکتہ بھی دوہہ ہی سے پیدا کیا جاتا ہے اور یہ ایسی بیت
ہے جس میں کوئی عارفانہ یا حکیمانہ رمز کی بات ہو۔ دوہہ کو اپنے مختلف پہلوؤں کے ساتھ
ہر زمانے اور ہر علاقے کے صوفیائے چشت نے شاعری اور موسیقی کے ضمن میں استعمال
کیا ہے۔ بابا فرید گنج شکرؒ، امیر خسروؒ، شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ اور دوسرے کئی چشتیہ

بزرگوں کے ہندی دوہے، سورٹھ اور نکتے تاریخ و تذکرہ کی کتابوں میں ملتے ہیں البتہ کافی اور سی حرفی کی طرز کم نظر آتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں اصناف شعر و موسیقی پنجابی زبان سے زیادہ وابستہ رہی ہیں۔

دوہے کے بعد قدیم صوفیائے چشت نے دھرپت، خیال، شلوک، گیت، بھجن، شبد، قول، جکری، چٹکلہ، کبت، ترانہ، ریختہ، تو تا برہی، چوپائی وغیرہ کی طرف بھی توجہ دی ہے۔ ان میں سے بعض اپنے نام اور کام کے اعتبار سے ہندوانہ اصناف معلوم ہوتی ہیں مثال کے طور پر دھرپت یا دھرپد کو لیجئے یہ صنف ہندی شعر و موسیقی میں دیوتاؤں کی تعریف کے لیے ایجاد ہوئی تھی۔ دھرپد گانے والوں کا عقیدہ ہے کہ یہ روحانی ترقی کا باعث ہوتا ہے۔ اسے گاتے وقت زیادہ تر سُر کے جمالیاتی پہلو کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ اس میں تان رمزے وغیرہ کی اجازت نہیں ہوتی اور سُر کو سیدھے سادے انداز میں گایا جاتا ہے۔ اسلامی حکومت کے ابتدائی دَور میں برصغیر میں دھرپت کا رواج بہت تھا بعض کہتے ہیں کہ اسے راجہ مان سنگھ نے ایجاد کیا تھا لیکن یہ اس زمانے سے بہت پہلے کی چیز معلوم ہوتی ہے البتہ تان سین نے اس میں رس اور عظمت زیادہ بھر دی ہے۔ ہوری بھی دھرپد ہی کی ایک قسم ہے اور ٹھمری سے ملتی جلتی ہے۔ ٹپہ دھرپد کی ضد ہے اور اسے سروں کی سادگی کے ساتھ استعمال کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ بشن پد' دھرپد کا ایک اور رُخ ہے جس میں وشنو تحریک کے پیروکار اپنے دیوتاؤں کی تعریف بیان کیا کرتے تھے۔ بعض نقادانِ عہد حاضر نے ان صوفیائے چشت کو جو لبشن پد گاتے تھے حقیقتِ حال کی بے خبری کی بنا پر وشنو تحریک سے متاثر کہا ہے اور اس طرح ان متقی، موحد اور خدا رسیدہ بزرگوں کو مطعون کرنے کی کوشش کی ہے۔ شاہ قطب الدین حقانی کی تصنیف مسائل المشائخ میں ہے کہ حضرت نور قطب عالم پنڈوی کی محفل سماع میں نعت وغیرہ کے ساتھ لبشن پد بھی گائے جاتے تھے۔

بات دراصل یہ تھی کہ جب چشتیہ صوفیا نے بنگال میں تبلیغ و تلقین اور رشد و ہدایت کا کام شروع کیا تو وہاں چیتانیہ کے زیر اثر وشنو سے محبت اور عقیدت پر مبنی موسیقی اور شعر کی خاص قسم لبشن پد مقبول عام تھی اور ہندو اپنی مجالس و محافل میں ان کی لَے پر رقص

کرتے اور مست ہوتے دکھائی دیتے تھے۔ صوفیائے چشت نے جب یہ دیکھا کہ ایسے بشن پد گیتوں کو ہندو بھی سنتے ہیں اور نومسلم بھی تو انھوں نے اسے مشرف بہ اسلام کرلیا۔ بشن پد میں جس وشنو کا ہندو ذکر کرتے ہیں وہ ہندوؤں کا اوتار یا دیوتا ہے۔ صوفیائے چشت نے اس اوتار اور دیوتا سے بشن پد گیتوں کے ذریعے لوگوں کا رُخ خدائے واحد کی طرف موڑ دیا۔ انھوں نے بشن پد کی ظاہری ہیئت کو تو قائم رکھا اور بعض رموز و علائم بھی وہی رکھے لیکن اس کے باطن میں وشنو کی بجائے خدا اور شرک کی بجائے توحید سمو دی۔ جسم وہی رہا روح بدل گئی۔ انھوں نے بشن پد کی شعری صورت اور موسیقانہ جسم میں اسلامی روح پھونک دی۔ پہلے بشن پد کی شعری ہیئت میں جہاں وشنو اور دوسرے اوتاروں کا ذکر ہوتا تھا اب خدائے واحد کی محبت کی بات ہونے لگی۔ غلط فہمی اس بات کو نہ سمجھنے سے پیدا ہوئی ہے کہ بشن پد تو صرف ایک ہیئت ہے موسیقی و شعر کی۔ اِس میں آپ وشنویت لے آئیں گے تو کفر و شرک ہو جائے گا، خدائے واحد کی بات کرنے لگیں گے تو اسلام و توحید بن جائے گا۔ صوفیائے چشت نے اس تدبیر سے بنگالی ہندوؤں کے دلوں میں خدائے واحد کا تصوّر اور نومسلموں کے قلب و ذہن میں توحید کا نقش راسخ کر دیا۔

مذکورہ بالا وضاحت کو مزید صاف کرنے کے لیے ایک مثال سامنے رکھیے۔ قصیدہ شاعری کی ایک مشہور صنف ہے جسے عرب شاعر زمانۂ جاہلیت میں بتوں کی تعریف، مناظرکشی، نسل پر فخر، عریاں خیالات کے اظہار اور حسن و عشق کے جذبات کے لیے استعمال کرتے تھے۔ یہی قصیدہ اسلام کے بعد بھی رائج رہا بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور کعب بن زہیر اور حسان بن ثابت جیسے عظیم شاعروں نے قصیدے پڑھے بھی ہیں تو کیا اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کریں کہ نعوذ باللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یا صحابہ نے غیر اسلامی شعر کا سماع فرمایا، ہرگز نہیں ہر صائب رائے رکھنے والا یہ نتیجہ کبھی اخذ نہیں کرے گا بلکہ وہ اس کے اس صحیح رُخ کو پالے گا کہ قصیدہ تو محض ایک صنف سخن ہے ایک سانچہ اور جسم ہے، اس میں کفر و شرک کے مضامین ہوں گے تو یہ صنف کافر ہو جائے گی، توحید و اسلام کی رُوح پھونک دیں گے تو مسلمان بن جائے

گی۔ زمانہ اسلام کے شاعروں نے یہی کام کیا ہے اور قصیدے کی ہیئت میں حمد و نعت اور اسلامی مضامین داخل کر کے اس پر اللہ اور دین کی چھاپ لگادی ہے اس سے ناپسندیدہ قصیدہ پسندیدہ ہو گیا چاہے اس کے لیے ہیئت اور رموز و علائم وہی کیوں نہ استعمال کئے گئے ہوں جو زمانہ اسلام سے قبل تھے۔ یہی حال بشن پد کا ہوا ہے۔ بشن پد ایک شعری ہیئت اور موسیقی کی ایک صورت ہے۔ اس میں جب تک وشنو کے اوصاف و فضائل تھے یہ مشرک و کافر رہی جونہی صوفیائے چشت نے اس میں خدا کی توحید کے مضامین بھر دیے اور عرفان و معرفت کی روح پھونک دی یہ صنف مسلمان ہو گئی۔ جب کوئی مشرک توحید کا اقرار کرتا ہے یا کوئی کافر مسلمان ہوتا ہے تو وہ اپنی نیت اور اپنا دل بدلتا ہے اپنی صورت نہیں بدلتا، یہی حال بشن پد کا ہے۔ صوفیائے چشت نے ان میں مضامین کفر کی بجائے موضوعاتِ توحید و عرفان اور جذباتِ عشق و وجدان بھر دیئے۔ انھوں نے یہ عمل صرف بشن پد کے ساتھ ہی نہیں بلکہ موسیقی اور ہندی شاعری کی تقریباً ہر صنف کے ساتھ کیا ہے اور اسلامی نقطۂ نظر سے ان کا یہ شعر و موسیقی پر بہت بڑا احسان ہے۔

دھرپد کے ساتھ گیت اور چھند دو اور اصناف موسیقی و شعر بھی برصغیر میں رائج تھیں لیکن سرپرستی نہ ہونے کی وجہ سے یہ دونوں دب گئیں۔ دھرپد کو بھی بعد میں خیال نے ماند کر دیا۔ خیال کے لغوی معنی تو تصوّر کے ہیں لیکن ہندی موسیقی کی اصطلاح میں خیال شعر کی وہ قسم ہے جس میں موضوع کے اعتبار سے تخیلاتی کارفرمائی بہت زیادہ ہو۔ ابتدا میں خیال، دھرپد کے قریب تھا لیکن بعد میں اس نے منفرد حیثیت اختیار کر لی۔ صوفیائے قدیم نے دوہے اور دھرپد کے مقابلے میں خیال کو کم استعمال کیا ہے۔ خیال امیر خسرو کی ایجاد کہا جاتا ہے جسے محمد شاہ بادشاہ دہلی کے عہد میں سدا رنگ نے مزید فنی حسن بخشا اور اسے شہرت عام اور بقائے دوام سے آشنا کیا۔ اسے بھی تین تال اور کبھی اکتال میں گاتے ہیں۔ مسلمان صوفیا نے دوہے اور پد کی طرح مضامین کی نوعیت بدلنے سے اس صنف شعر و موسیقی کو بھی ہندوانہ فضا یا دنیوی آلائشوں سے الگ کیا ہے۔ خیال بھی دوہے اور دھرپد کی طرح راگ کی ایک ہیئت ہے۔ اس میں جو بول ہم بھر دیں گے وہی اس کا مقدر ہو جائے گا۔

مثال کے طور پر اگر ہم خیال گانے کے لیے یہ الفاظ کام میں لائیں "آل نبی اولاد علی" تو اس کی مذہبی صورت ہی بدل جائے گی۔ صوفیائے چشت نے یہ عمل موسیقی اور ہندی شاعری کی تقریباً ہر صنف کے ساتھ کیا ہے۔ بکٹ کہانی، کبت، شبد، اشلوک وغیرہ تک میں انھوں نے اسلامی رنگ بھر دیا ہے اور ہندی شاعری کے رموز و علائم کو اوتاری اور دیو مالائی پس منظر کی بجائے انھوں نے مسلمانی فضا بخشی ہے۔ کبت سخن کی وہ قسم ہے جس میں متعدد مصرعے ایک ہی وزن اور ردیف قافیہ کے ساتھ مسلسل آتے ہیں اور آخری مصرع ان سے علیحدہ ہوتا ہے۔ شبد ان شعروں کو کہتے ہیں جن کو بطور وظیفہ پڑھا جاتا ہے۔ اشلوک بھی اسی مقصد کے حامل ہوتے ہیں۔ چشتی صوفیا نے ان کی مذہبی فضا بدل کر انہیں رام سے رحیم کے وظیفہ میں ڈھال دیا ہے۔

قول اور ریختہ بھی بعض دوسری اصناف شعر و موسیقی کی طرح صوفیائے چشت ہی کی ایجاد ہیں۔ یہ دونوں امیر خسروؒ کی ایجادات سمجھی جاتی ہیں۔ قول جس سے قوالی نکلتی ہے تال بھی ہے اور گانے کا انداز بھی۔ رباعی کو جب راگ میں باندھا جاتا ہے تو اسے قول کہتے ہیں۔ راگ، سرود کی ایک ایسی ترتیب کا نام ہے جو سننے والے کے ذہن میں ایک خوش گوار تاثر پیدا کرتی ہے۔ اس میں کم سے کم پانچ سُر ہوتے ہیں۔ سیدھے سادے الفاظ میں سُروں کے ایک ایسے مجموعے کو جس کی ادائیگی سے ایک خاص قسم کا تاثر پیدا ہو راگ کہتے ہیں۔ راگ کی بنیاد تین چیزوں پر رکھی جاتی ہے۔ جنہیں ہم رنگ، رس اور روپ کہتے ہیں۔ رس راگ کا بنیادی جذبہ کہلاتا ہے۔ راگ میں قول گانے والا قوال کہلاتا ہے۔ یہی قول اب قوالی کی عام صورت اختیار کر گیا ہے۔ ریختہ بھی گیت ہی کی ایک قسم ہے جو قول کی طرح امیر خسروؒ ہی کی ایجادات میں سے ہے۔ عہد اکبری کے ایک ریختہ گو شاعر سعدی کاکوروی نے ریختہ کو اسی لیے گیت کہا ہے۔

سعدی کہ گفتہ ریختہ، دَر ریختہ دُر میختہ
شیر و شکر آمیختہ، ہم شعر ہے ہم گیت ہے

امیر خسروؒ اور ان کے پیر بھائی امیر حسن سنجریؒ نے اس قسم کی ریختہ میں کافی شعر کہے ہیں۔ بعض قدیم بیاضوں سے باوا فرید گنج شکرؒ کے ریختہ کا بھی پتہ چلتا ہے۔ حافظ محمود شیرانی نے اپنی کتاب "پنجاب میں اردو" میں اس کا نمونہ دیا ہے[1]

ریختہ موسیقی کی اصطلاح بھی ہے اور اسے اردو شاعری اور زبان کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے یہ نام غالب کے دور تک دیکھنے میں آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
سنتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

ریختہ کی وجہ تسمیہ میں ہمارے تذکرہ نگاروں، محققوں اور نقادوں نے کئی خیال آرائیاں کی ہیں بہر حال محمد حسین آزاد کی رائے زیادہ قابلِ اعتبار ہے۔ وہ آبِ حیات میں لکھتے ہیں کہ اُردو کو اس لیے ریختہ کہتے ہیں کہ مختلف زبانوں نے اسے ریختہ کیا ہے جیسے دیوار کو اینٹ، مٹی، چونا سفیدی وغیرہ پختہ کرتے ہیں۔ میر تقی میر نے تذکرہ نکات الشعرا[2] میں ریختہ کی مختلف طرزوں کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ ریختہ کی چار قسمیں ہیں اوّل یہ کہ ایک مصرع ہندی ہو اور ایک مصرع فارسی ہو۔ دوئم یہ کہ نصف مصرع فارسی ہو اور نصف ہندی۔ سوئم یہ کہ اس میں فارسی کا عنصر حروف و افعال کی صورت میں ہو اور چہارم یہ کہ اس

---

[1] : پنجاب میں اُردو، حافظ محمود شیرانی (عنوان باوا فرید الدین گنج شکر)

[2] : نکات الشعراء - ابتدائیہ۔

میں فارسی کی تراکیب پائی جائیں امیر حسنؒ، امیر خسروؒ اور بابا فریدؒ نے عام طور پر ریختہ کی پہلی دو صورتوں کو اختیار کیا ہے اور اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ یہ صورتیں موسیقی کے قریب تر ہیں۔

امیر خسروؒ نے جب ایرانی اور ہندی موسیقی کے اتحاد سے موسیقی کی نئی صورتیں قول، ترانہ، معرونی، دو بحری وغیرہ وضع کیں تو انھوں نے ریختہ کی اصطلاح بھی بنائی۔ اس اصطلاح سے موسیقی میں یہ مقصد قرار پایا کہ جو فارسی خیال ہندی (ہندوی) کے مطابق ہو اور جس میں دونوں زبانوں کے سرود ایک تال اور ایک راگ میں بندھے ہوں ریختہ ہے۔ ریختہ کے لیے کسی پردہ کی قید نہیں۔ وہ ہر پردہ میں باندھا جاتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار ریختہ کے ضمن میں حضرت علاؤالدین ثانی برناوی چشتیؒ نے کتاب چشتیہ میں کیا ہے[1]۔ ان کے پیر حضرت بہاالدین برناویؒ نے بھی جو امیر خسروؒ کی طرح فن موسیقی کے بہت بڑے ماہر تھے ریختہ کی اسی قسم کی تعریف کی ہے۔ ریختہ کی اس اصطلاح نے جب بعد میں عمومیت اختیار کی تو یہ پہلے اُردو شعر اور پھر اُردو زبان کے لیے استعمال ہونے لگی۔

اردو زبان چونکہ ابتداء میں ہندی اور فارسی عربی الفاظ سے ریختہ ہوئی ہے۔ اس لیے اصولی طور پر اس کے معماروں میں ہر اس شخص کا نام آنا چاہیے جس نے اپنی تحریر یا تقریر کے ذریعے اس زمانے میں کچھ نہ کچھ حصّہ ادا کیا ہے جب مسلمان نئے نئے دہلی اور اس کے گرد و نواح میں آئے تھے ان میں چشتی صوفیا کے کام کو سرفہرست جگہ ملنی چاہیے اگرچہ بعد میں بھی اس گروہ کے صوفیا اور اس سلسلے میں مرید شاعروں نے اُردو کی ترویج و ترقی میں نمایاں حصّہ لیا ہے لیکن "سابق ہی اوّل ہوتے ہیں" کے مقولے کے پیش نظر ان ابتدائی صوفیائے چشت کی خاص اہمیت ہے۔ اُردو زبان نے جب باقاعدہ شکل اختیار کر لی اور اُردو شاعری کی باقاعدہ شکل نکل آئی تو اس وقت بھی سلسلۂ چشت سے متعلق کافی شعرا نظر آتے ہیں۔

قدرت اللہ قاسم، مولانا فخرالدین چشتیؒ کے مرید تھے[2]۔ احسن اللہ احسن شیخ محمد امان خلیفہ فخرالدین چشتیؒ سے بیعت تھے۔ میر حسن نے تذکرۃ الشعراء میں محمد میر المتخلص بہ سوز کے متعلق لکھا ہے کہ

---

[1]: مقالات شروانی، ص ۲۹۹ [2]: مجموعہ نغز۔ جلد اوّل، ص ۵۴

وہ سید ضیاء الدین بخاری کے بیٹے تھے جو گجرات کے مشہور چشتی بزرگ حضرت قطب عالمؒ کی اولاد میں سے تھے۔[1] میر قمر الدین منت کے متعلق تذکرہ نگاروں نے کہا ہے کہ ان کا سلسلہ نسب والدہ کی طرف سے سید جلال الدین بخاریؒ تک پہنچتا ہے۔ ان کا تعلق بھی سلسلہ چشتیہ سے تھا۔ منت کی خاندانِ شاہ ولی اللہ سے بھی نسبت تھی[2] لیکن بیعت ان کی شیخ فخر الدین چشتی دہلویؒ سے تھی۔ سراج الدین علی خان آرزو کا باپ کی طرف سے سلسلہ نسب شیخ کمال الدین خواہرزادہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی چشتیؒ سے اور ماں کی طرف سے شیخ محمد غوث گوالیاری چشتی تک پہنچتا ہے۔ یہی خان آرزو میر تقی میر کے سوتیلے ماموں بھی تھے۔ میر تقی میر کے والد میر علی متقی مشہور چشتی بزرگ شاہ کلیم اللہ اکبر آبادیؒ کے ارادت مند تھے۔ محمد حسین کلیم میر تقی میر کے بہنوئی تھے اور شاہ مبارک آبرو بھی سراج الدین علی خان آرزو کی طرح حضرت گوالیاریؒ کی اولاد میں سے تھے۔ مرزا مظہر جانجاں نقشبندیہ سلسلہ کے صوفی ہونے کے باوجود شاہ کلیم اللہ چشتیؒ کی صحبت سے بھی فیض یاب تھے۔ بعض تذکرہ نگاروں نے انہیں شیخ محمد عابد سنامیؒ کا مرید بھی بتایا ہے۔ جن سے انھوں نے چشتیہ، سہروردیہ اور قادریہ تینوں سلسلوں میں سبق حاصل کیا اور اجازت لی تھی۔ میر عظیم الدین خان آشفتہ عرف بھورے خان کو قدرت اللہ قاسم نے مولانا فخر الدین چشتیؒ کے خلیفہ حضرت مجیب الدین کا مرید بتایا ہے۔[3] مولوی محمد بسمل کو جو میاں صاحب کے لقب سے معروف تھے کریم الدین اور فیلن نے تذکرۃ الشعرائے اردو میں میر محمدی بیدار شاگرد خواجہ میر درد کا تلمیذ قرار دیا ہے[4] اور محمدی بیدار کی نسبت خواجہ میر دردؒ کے نقشبندیہ محمدیہ سلسلہ کے ساتھ ساتھ چشتیہ سلسلے سے بھی بتائی گئی ہے۔ خواجہ احسن اللہ بیان کو مؤلف گل رعنا نے مولانا فخر الدین چشتیؒ کا مرید بتایا ہے۔[5] مجموعہ نغز کے مؤلف

---

[1] : لکھنؤ کا دبستان شاعری از ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی، ص ۱۳۵

[2] : لکھنؤ کا دبستان شاعری، ص ۱۲۹

[3] : مجموعہ نغز جلد اول، ص ۳۱

[4] : تذکرۃ الشعرا، ص ۱۱۸ / ۲۰۶ / ۲۱۷

[5] : گل رعنا، ص ۱۹۲

نے بھی ان کا ذکر کیا ہے اور شاعری میں انہیں مرزا مظہر جانجاں کا شاگرد بتایا ہے۔[1] مولانا فخر الدین چشتیؒ کے مریدوں میں عنایت اللہ حجام، مولوی امجد امجد، میر حسن حسنی وغیرہ کے نام بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔[2] شرف الدین مضمون خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ کی اولاد میں سے تھے۔ میر محمد حسین کلیم حضرت قطب عالم چشتی گجراتی کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ شاہ قدرت اللہ قدرت مشہور چشتیہ بزرگ شاہ عبد العزیز شکر بار چشتیؒ کے مرید تھے، شاہ عشق اللہؒ سے بھی فیض حاصل کیا تھا۔ میر مکھن پاک باز پسر شاہ کمال بھی چشتیہ مسلک رکھتے تھے۔ مصطفیٰ خان یکرنگ کی نسبت بھی چشتیہ سلسلے سے تھی۔ سعادت علی سعادت بھی چشتیہ خاندان میں بیعت تھے۔ محمد علی دہلوی شیخ سلیم چشتیؒ کی اولاد میں سے تھے۔ تذکرہ عیار الشعراء میں خوب چند ذکا نے ان کا ذکر کیا ہے۔ شیخ نظام الدین عنایت مولانا شاہ فخر الدینؒ کے مرید اور رڑول کے قاضی کے بیٹے تھے۔

اس مختصر فہرست میں شامل شاعروں کے علاوہ ابتدائی دَور کے اور کئی شاعر بھی چشتیہ مسلک سے تعلق رکھنے والے تھے جن کا ذکر میر تقی میر کے تذکرۃ الشعراء، قیام الدین قائم کے مخزن نکات، فتح علی گردیزی کے تذکرہ حسینی، میر حسن کے تذکرۃ الشعراء، لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی کے تذکرہ گل رعنا اور تذکرہ چمنستانِ شعراء، سراج الدین علی خان آرزو کے تذکرہ مجمع النفائس، اسد علی خان تمنا کے تذکرہ گل عجائب، غلام ہمدانی مصحفی کے تذکرہ ہندی گویاں، تذکرہ ریاض الفصحا اور تذکرہ عقد ثریا میں ملتا ہے۔ چندر بھان برہمن، بندرا بن داس خوش گو اور آنند رام مخلص جیسے عالموں اور ادیبوں کی فارسی تصانیف میں بھی ایسے ایسے اردو و فارسی شاعروں کے نام ملتے ہیں جن کا مسلک درویشی تھا۔ ان میں سے بعض کے متعلق تو واضح طور پر چشتیہ خاندان سے تعلق کی نشان دہی کی گئی ہے۔ وہ شاعر ان سے الگ ہیں جن کے سلسلہ تصوف کا ذکر تو کتابوں میں نہیں لیکن اگر تحقیق کی جائے تو

---

[1] : مجموعہ نغز جلد اوّل ص ۱۲۳، مولف قدرت اللہ قاسم

[2] ، تذکرۃ الشعراء از کریم الدین ص ۱۱۸ / ۲۰۶ / ۲۱۷

سلسلۂ چشتیہ سے ان کا دامن الگ نہیں ہوگا۔ اس ضمن میں تذکروں کی مندرجہ ذیل عبارتوں کو خاص طور پر دیکھیے۔

میر مستقیم جرأت محمد شاہ بادشاہ کے ہم عصر تھے اور عابدانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ جان علی شاہ جان میر تقی میر کے شاگرد نتھن شاہ سکندر آبادی کے مرید تھے۔ بنجھا شاہ ایک غیر معروف شاعر کے متعلق تذکرہ ابراہیم میں لکھا ہے کہ وہ ایک درویش اور پُر گو شاعر تھے۔ میر محمدی شرف نواب دوراں کے بھتیجے اور دلّی کے رہنے والے تھے۔ اسپرنگر نے فہرست کتب خانہ اودھ میں کہا ہے کہ صوفی تھے۔ میر قمرالدین آفاق حضرت شاہ سلیمان اولیاء دہلوی کے عزیزوں میں سے تھے۔ شاہ حسین عارف بھی ایک درویش شاعر تھے اور دلّی میں قدم شریف کے پاس رہتے تھے۔ شاہ غلام محمد المتخلص بہ غلامی شاہ ظہورالدین حاتم کے دوست تھے اور انہی کی مثل یہ بھی شاہ تسلیم کے تکیہ پر بیٹھا کرتے تھے۔ سفر شاہ ایک غیر معروف شاعر کے متعلق خوب چند ذکا نے عیار الشعراء میں لکھا ہے کہ یہ سید درویش ہیں اور دلّی میں رہتے ہیں، فتح محمد نام، دل تخلص شاہ مبارک آبرو کے ہم عصر تھے اور گوالیار کے درویش مسمی بہ محمد کے پوتے تھے۔ میر جعفر خان دہلوی المتخلص بہ صادق، سید محمد قادری کے پوتے تھے۔ قادری صاحب ایک بزرگ تھے اور ان کا مزار دلّی کے قریب ہے پوتے کی نسبت نہ جانے کس سلسلے سے تھی۔ میر شاکر علی دہلوی المتخلص بہ شاکر کے ذکر میں سرور لکھتے ہیں کہ شاہ محمد عظیم سے مولانا روم کی مثنوی اور تصوف کی دوسری کتابیں پڑھا کرتے تھے۔ قائم اور شیفتہ نے بھی اپنے تذکروں میں اس کی تائید کی ہے۔ غلام قلندر شاہ قلندر ساکن مکھوا قریب منگیر میر محمد اسلم کے مرید تھے۔ شورش نے اپنے تذکرہ میں ان کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ برس ہوئے کہ دلّی چلے گئے۔ دلّی کے قرب و جوار کے کچھ اور لوگ بھی تھے جن کی درویش منشی سے پتہ چلتا ہے کہ صرف دلّی میں ہی نہیں بلکہ اس کے گرد و نواح میں بھی درویشی کا خاصا اثر تھا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کا مضمون "دبستان دلّی کا درویشی پس منظر" مشمولہ اورینٹیل کالج میگزین لاہور ۸۷/ ۱۹۸۶ ملاحظہ ہو۔

ان اور ان جیسے دوسرے کئی شاعروں کی نسبت ارادت واضح نہیں لیکن قرائن ان کو

چشتیہ سلسلے سے الگ نہیں دیکھتے۔ اس لیے کہ اس دور کے دوسرے سلاسل کے درویش بہت کم تھے اور جو تھے بھی وہ کسی نہ کسی طرح چشتیہ سلسلے سے منسلک تھے۔ اس وقت دلّی، ملتان ہانسی، اجودھن، سرہند، امروہہ، بلگرام، گلبرگہ، سیہون، پانی پت، اوچ، ناگور، اجمیر میں صوفیا کے مراکز اور خانقاہیں قائم ہو چکی تھیں۔ ان خانقاہوں میں چاہے سیہون شریف کے شہباز قلندرؒ ہوں یا پانی پت کے بوعلی قلندرؒ چاہے سرحد کے خوشحال خاں خٹک ہوں چاہے ملتان کے بہاء الدین زکریاؒ چاہے سرہند کے شیخ مجدد الفؒ ثانی ہوں چاہے دلی کے شاہ ولی اللہؒ وہ کسی نہ کسی طرح سلسلہ چشتیہ کے مرکز سے ضرور منسلک تھے۔ سیّد جلال الدین بخاری کے متعلق جن کا نام جلال الدینؒ اور لقب مخدوم جہا نیاں تھا۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار میں کہتے ہیں کہ ان کو سلسلہ قادریہ سے گہری محبت تھی لیکن وہ خلیفہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کے تھے جو چشتیہ بزرگ تھے اوچ شریف ان کی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ وہ شیخ رکن الدین ابوالفتح قریشیؒ کے بھی مرید تھے۔ مکّہ معظمہ میں امام عبد اللہ یافعیؒ کے ساتھ بھی رہے ہیں۔ شیخ کے ملفوظات فارسی زبان میں خزانہ جلالی کے نام سے ملتے ہیں۔ شیخ محدّث نے ان کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ وہ چودہ خانوادوں میں مرید تھے[۲]

شیخ احمد سرہندیؒ المعروف بہ مجدد الف ثانی نقشبندیہ سلسلے میں خواجہ باقی باللہؒ سے فیض یاب ہونے سے پہلے اپنے والد بزرگوار سے سلسلہ چشتیہ قادریہ سہروردیہ اور کبرویہ میں خلیفہ مجاز تھے[۳] خواجہ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ جو سلسلہ سہروردیہ کے بانی بزرگ ہیں خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ سے دوستی اور ہم صحبتی کے گہرے رشتوں میں منسلک تھے شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے لکھا ہے کہ بعض نے انہیں خالہ زاد بھائی بھی کہا ہے[۴]۔ شیخ احمد

---

۱ : اخبار الاخیار، ص ۲۵۵

۲ : اخبار الاخیار، ص ۲۵۴

۳ : اخبار الاخیار، ص ۵۲۸

۴ : اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار ص ۵۹

عبدالحق رودلویؒ شیخ جلال الدینؒ پانی پتی کے مرید تھے۔ مشہور چشتیہ بزرگ نور قطب عالم پنڈوی خلف الصدق شیخ عبدالحق پنڈویؒ چشتی سے بھی ان کی صحبت رہی ہے۔ شیخ امان پانی پتیؒ شیخ محمد حسنؒ کے مرید تھے اور شیخ محمد حسنؒ کے والد شیخ حسن طاہرؒ، راجی حامد شاہؒ کے اور وہ شیخ حسام الدین رام پوری کے مرید تھے جو چشتیہ مسلک رکھتے تھے اور شیخ نور قطب عالمؒ کے خلیفہ تھے۔ شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ نے اپنے والد کو بھی شیخ امان پانی پتیؒ کے مریدوں میں سے کہا ہے۔ میاں شیخ عبداللہ بدایونیؒ اکبری دور کے بہت بڑے بزرگ تھے وہ نقشبندی بزرگ خواجہ باقی باللہؒ کے ہاتھ پر بھی بیعت تھے اور شیخ صفی خیرآبادیؒ اور دوسرے بزرگوں سے بھی وابستہ رہے ہیں۔ میاں شیخ لادن دہلویؒ اور سید جلال الدینؒ بدایونی سے بھی ان کو بڑی عقیدت تھی۔ حضرت خواجہ خاوند محمود نقشبندی المعروف بہ حضرت ایشانؒ کے تیسرے فرزند خواجہ محمد خاوندؒ تھے۔ ان کے دو پوتے خواجہ محمد کامگار خان اور خواجہ نورالدین (پسران خواجہ برہان الدین نقشبندی) چشتیہ سلسلے کے مشہور بزرگ حضرت نظام الدینؒ اورنگ آبادی کے مرید و خلیفہ تھے۔ شیخ عبدالحق محدّث دہلوی کے چچا شیخ رزق اللہ چشتیہ مسلک رکھتے تھے۔ سادات امروہہ کے مورث اعلیٰ اگرچہ سہروردی بزرگ ہیں لیکن ان کا اور ان کے خاندان کے دوسرے بزرگوں کا چشتیہ سلسلے سے بھی تعلق رہا ہے۔ بلگرام کے سادات بھی اس تعلق سے الگ نہیں ہیں۔ یہ صرف چند مثالیں ہیں اس فہرست میں کافی اضافہ ہوسکتا ہے۔

مذکورہ بالا حقیقت بیان کرنے سے میری مراد صرف یہ ہے کہ وہ درویش اور درویش منش شاعر جن کا تعلق دبستانِ دلّی کے دورِ اوّل یا بعد سے ہے تذکروں میں اپنی روحانی شناخت ہونے یا نہ ہونے کے باوجود کسی نہ کسی طرح سلسلہ چشتیہ سے منسلک ہوگئے ہیں مثال کے طور پر شیخ عبداللہ ابدال دہلیؒ کے مشہور صاحب حال مجذوب تھے۔ اکبری اور جہانگیری دور پایا تھا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے رشتہ داروں میں سے تھے بلکہ ان کے دادا کے جو چشتیہ سلسلے سے منسلک تھے بھانجے تھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار میں لکھتے ہیں[1] کہ شیخ ابدال بازار میں ناچتے ہوئے

---

[1] اخبار الاخیار ص ۳۱۰/۴۸۲ (اردو ترجمہ ناشر ملک چنن الدین لاہور)

چلتے تھے اور اپنے حسب حال ہندی میں دوہے گایا کرتے تھے۔ آپ کے ساتھ لوگ بھی دف اور ستار بجاتے چلنے لگتے تھے۔ شیخ محدث یہ بھی کہتے ہیں کہ جب ان کے یعنی شیخ کے چچا شیخ رزق اللہ چشتی گجرات گئے تھے تو انھوں نے شیخ ابدال کے بہت سے دوہے گجراتیوں سے سُنے تھے۔ شیخ برہان کالپی (متوفی ۱۰۰۰ھ) مہدویہ سلسلہ کے فقیر تھے شیخ محدث نے ان کے دوہوں کا بھی ذکر کیا ہے[1]۔ مہدویہ سلسلہ کے فقیروں کے آباؤ اجداد کا تعلق چشتیہ سلسلے سے رہا ہے۔ قاضی محمود دریائی کی ہندی جکریاں بڑی مشہور ہیں انہیں قوال اکثر گایا کرتے تھے۔ مولوی عبدالحق نے کتاب "اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" میں ان کا ذکر کیا ہے۔ بلگرام کو کسی زمانے میں علم وفضل کی فضا کی بنا پر بڑی اہمیت حاصل تھی بعض اسے ہندوستان کا یونان اور بعض شیراز کہتے تھے۔ اس قصبہ نے کافی تعداد میں درویش منش شاعر اور عالم و فاضل پیدا کیے ہیں۔ آزاد بلگرامی نے تذکرہ مآثر الکرام میں ان میں سے کئی ایک کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے ایک بزرگ شیخ شاہ محمد بن شیخ فرملی تھے جن کے ہندی دوہے اب تک مشہور ہیں[2] دیوان رحمت اللہ رحمت بلگرامی نے پورن رس سید نظام الدین مدھنائک بلگرامی نے نادچندر کا اور مدھنائک سنگار، میر عبدالجلیل بلگرامی نے سکھ نکھ، سید غلام نبی بلگرامی نے انک درپن اور سید برکت اللہ پیمی بلگرامی نے پیم پرکاش کے نام سے اپنی اپنی ہندی شاعری کے مجموعے مرتب کیے ہیں۔ ان میں دوہے، کبت، دھرپد، بشن پد وغیرہ کئی اصناف شعر و موسیقی موجود ہیں۔ ان میں زیادہ تر عرفان و معرفت کی باتیں ہی کی گئی ہیں۔ بلگرام کے بعض علماء و مشائخ کا تعلق مارہرہ (ضلع ایٹہ) سے بھی رہا ہے۔ مثال کے طور پر سید برکت اللہ پیمی نے جو میر عبدالجلیل بلگرامی کے پوتے تھے بلگرام سے مارہرہ جا کر سکونت اختیار کر لی تھی۔ ان کے دادا کا مزار بھی وہیں ہے۔ صوفیائے چشت سے ان بزرگوں کے کسی نہ کسی تعلق کا سراغ مل جائے گا۔

---

[1]: اخبار الاخیار ص ۴۷۲/۴۷۴ (اُردو ترجمہ ناشر ملک چنن الدین لاہور)

[2]: مآثر الکرام، ص ۳۵۳

لیکن میں نے زیرِ نظر کتاب میں صرف ان صوفیائے چشت کی اُردو خدمات کا ذکر کیا ہے جو واضح طور پر چشتیہ مسلک رکھتے تھے۔ آئندہ صفحات پر ایک تو ان قدیم چشتی صوفیا کا ذکر ملے گا جن سے صرف ہندوی (قدیم اُردو) کے صرف چند الفاظ اور ابیات ہی منسوب ہیں اور دوسرے ان قدیم بزرگانِ چشت کا جن کی نظم و نثر کی باقاعدہ تحریریں موجود ہیں۔ یہ لوگ خصوصاً پہلی قسم کے لوگ تاریخ ادب اُردو میں اس لیے اہمیت رکھتے ہیں کہ انھوں نے ایسے زمانے میں اُردوئے قدیم کی طرف توجہ دی ہے جب برصغیر میں فارسی کی حکمرانی بلکہ اس کی لسانی اور ادبی آمریت تھی۔ ان چشتیہ بزرگوں یا ان سے منسلک ادیبوں اور شاعروں نے قدیم اُردو کے چاہے چند الفاظ اور ابیات ہی کیوں نہ کہی ہوں ان کی اُردو دانی کے ساتھ ساتھ ان کی اُردو ترویج کی کوششوں یا کم از کم ان کی اُردو نسبتی کا پتہ ضرور چلتا ہے۔ بعد کے بزرگوں اور ادیبوں نے چاہے اُردو میں باقاعدہ کتابیں کیوں نہ تصنیف کر لی ہوں چاہے دیوان اور کلیات کیوں نہ مرتب کر لیے ہوں تاریخ ادب اُردو میں جو قیمت اور اہمیت ان ابتدائی بزرگوں کی ہو سکتی ہے۔ ان کے بعد کے لوگوں کی نہیں۔ کسی بھی ایجاد کی تاریخ میں ان مٹ نام اس کے موجد کا ہوتا ہے۔ بعد میں آنے والے چاہے اس پر لاکھ اضافے کریں ان کے نام اور کام کی اہمیت وہ نہیں ہوتی جو اس چیز کے موجد کی ہوتی ہے۔ اُردو زبان و ادب کی تاریخ میں بھی ان لوگوں کے نام اَن مٹ ہیں جنھوں نے اُردو کو اس وقت منہ لگایا جب اس کی طرف کوئی دیکھتا نہ تھا۔ بعد کے آنے والوں کو اُردو کے ترقی دینے والوں میں تو شمار کیا جا سکتا ہے، اردو کو ابتدائی ترویج دینے والوں میں نہیں۔ وہ چشتیہ بزرگ جنھوں نے اُردوئے قدیم کا ایک لفظ، ایک جملہ، ایک بیت بھی کہی ہے وہ قافلہ اُردو کے ہراول دستہ میں شمار ہوتے ہیں بعد میں چاہے فوج در فوج چشتیہ مسلک رکھنے والے ادیب و شاعر پیدا ہوئے ہوں ان کی حیثیت ثانوی رہ جاتی ہے۔

آغاز

خواجہ معین الدین چشتی سنجری اجمیری رحمۃ اللہ علیہ

خواجہ معین الدین چشتیؒ برصغیر پاک و ہند میں تصوف کے سلسلہ چشتیہ کے مؤسس اعلیٰ ہیں۔ ملا عبدالحمید لاہوری نے بادشاہ نامہ میں ان کے والد کا نام خواجہ حسین اور پیشہ زراعت بتایا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ انہیں سنجری کہتے ہیں جو کہ سنگری کا معرب ہے[1]۔ کافی سیر و سیاحت اور تحصیل علوم کے بعد آپ نے نیشاپور کے نواحی قصبے ہارون میں شیخ عثمان ہارونیؒ سے بیعت کی۔ اپنے مرشد کے ساتھ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ بھی گئے۔ سید الاقطاب مصنفہ اللہ دتا بن عبدالرحیم اور مونس الارواح (ملفوظات عثمان ہارونیؒ) میں لکھا ہے کہ مدینہ منورہ کے قیام کے دوران جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ہندوستان پہنچنے اور وہاں رشد و ہدایت کا باب کھولنے کا حکم دیا۔ ہندوستان میں آنے کے بعد انھوں نے تکمیل مراحل باطنی کے لیے غزنویہ دور کے مشہور ولی حضرت شیخ علی ہجویری المعروف بہ داتا گنج بخشؒ کے مزار پہ لاہور میں چلہ کشی کی اور ایک روایت کے مطابق حصول مقصد کے بعد داتا صاحب کی منقبت میں یہ شعر کہا ہے[2]:

گنج بخش فیضِ عالم مظہرِ نورِ خدا
ناقصاں را پیرِ کامل، کاملاں را رہنما

خواجہ بزرگ کے چلّے کا مقام اب تک داتا گنج بخشؒ کے مزار کے قریب محفوظ ہے اور زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ لاہور سے وہ ملتان گئے اور پھر وہاں سے دلّی اور دلّی سے اجمیر (بھارت) پہنچے۔ وہ اجمیر ہی میں فوت ہوئے اور یہیں ان کا مزار ہے۔ ملّا عبدالحمید لاہوری نے بادشاہ نامہ میں لکھا ہے[3] کہ ان کا سلسلہ روحانیت دو واسطوں سے

---

[1] : بادشاہ نامہ جلد اوّل ص ۸۱ / ۸۲

[2] بزم صوفیا از صباح الدین عبدالرحمٰن ص ۳۹

[3] بادشاہ نامہ جلد اوّل ص ۸۱ / ۸۲

حضرت خواجہ مودود چشتیؒ اور سات واسطوں سے حضرت ابراہیم ادہمؒ تک پہنچتا ہے۔ نواب صدیق حسن خان نے تذکرہ روز روشن میں ان کے ایک فارسی دیوان کا ذکر کیا ہے[1] اور نمونے کے کچھ شعر بھی دیے ہیں یہ دیوان مطبع نول کشور لکھنؤ کی طرف سے شائع ہو چکا ہے لیکن بعض جدید محققین کہتے ہیں کہ یہ دیوان ان کا نہیں بلکہ ایک اور شاعر معین فراہی کا ہے[2]۔ واللہ اعلم۔
حافظ محمود شیرانی نے بھی مضمون دیوان حضرت معین الدین حسن سنجری چشتی میں اس کی تائید کی ہے[3]۔

خواجہ بزرگ کے ہندی کلام کے متعلق قطعیت سے اس وقت تک کچھ نہیں کہا جا سکتا جب تک کہ ان کے کلام کا نمونہ نہ ملے۔ البتہ قدیم کتب کے حوالے سے اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ جب خواجہ بزرگ دربار داتا گنج بخش پر چلہ کشی کے بعد ملتان گئے تو وہاں انھوں نے تقریباً پانچ سال تک قیام کیا اور اس دوران میں ہندوؤں کی زبان یعنی مقامی زبان بھی سیکھی[4]۔ جب وہ اجمیر پہنچے تو وہاں ان کا واسطہ صرف انہی لوگوں سے پڑا جو فارسی عربی سے کاملاً ناواقف اور غیر مسلم تھے۔ ان کی ہندی دانی نے یہاں کام کیا اور ان کا اس زبان کو سیکھنا بھی اسی تبلیغی مقصد کے لیے تھا۔ ملک محمد جائسی کی تصنیف اکھروٹی (جو مطبع مجیب ہند دہلی سے شائع ہو چکی ہے) کی شرح کے آخر میں لکھا ہے کہ یہ خیال نہ کریں کہ اولیاء اللہ نے عربی زبان کے سوا کسی اور زبان میں کلام نہیں کیا کیونکہ تمام اولیاء اللہ ملک عرب سے خاص نہ تھے پس جس ملک میں یہ گئے اس ملک کی زبان کو کام میں لائے اور گمان نہ کریں کہ کسی ولی نے ہندی زبان میں بات نہیں کی کیونکہ جملہ اولیاء اللہ میں سے اوّل قطب الاقطاب خواجہ بزرگ معین الحقؒ نے اس زبان میں سخن فرمایا اس کے بعد حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ نے۔ اکھروٹی کے فاضل شارح کے اس بیان سے تصدیق ہوتی ہے کہ خواجہ معین الدین چشتیؒ نے ہندی زبان میں تبلیغ و تلقین ضرور

---

[1]: تذکرہ روز روشن، ص ۶۳۷

[2]: مضمون دیوان خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ از ابراہیم ڈار، رسالہ اردو جولائی ۱۹۵۰ء ص ۵۷

[3]: رسالہ اردو، جولائی ۱۹۲۴ء

[4]: بزم صوفیا از صباح الدین عبدالرحمٰن ص ۴۳

ں ہے ۔ اگر ان کی باتیں محفوظ ہوتیں تو ہندی ملفوظات کے طور پر ضرور ہم تک پہنچتیں معلوم ہوتا ہے کہ جو باتیں صوفیائے چشت نے اس زمانے میں ہندی زبان میں کی ہیں ان کے ملفوظات کے مرتبین نے ان کو فارسی کے سانچے میں ڈھال کر ہم تک پہنچایا ہے کیونکہ اس وقت کی علمی زبان یہی تھی ۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے کتاب "اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کے کام" میں لکھا ہے[1] کہ افسوس باوجود تلاش کے ہمیں حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ قدس سرہ العزیز کا کوئی معتبر قول ہندی زبان میں نہیں ملا ۔ لیکن ان کی عالم گیر مقبولیت کو دیکھتے ہوئے یقینی امر ہے کہ وہ ہندی زبان سے ضرور واقف تھے کیونکہ ہندو بھی ان کے کم معتقد نہ تھے ۔ ہند الولی کی ترکیب اور غریب نواز کا لقب خود ان کی عام مقبولیت کی صاف شہادت دے رہا ہے ۔ مولوی عبدالحق مرحوم کے اس بیان سے قطع نظر کہ ہندو بھی ان کے معتقد تھے ۔ ان کے تبلیغی اور رابطۂ عوام کے کام کو دیکھتے ہوئے یہ بات یقینی ہو جاتی ہے کہ انھوں نے مقامی زبان ضرور استعمال کی ہوگی ۔ اس مقامی زبان کو مورخین و تذکرہ نگاروں نے ہندی (ہندوی) کہا ہے ۔ رسالہ دلیل العارفین خواجہ بزرگ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جسے حضرت قطب الدین بختیار کعکیؒ نے مرتب کیا ہے ۔ اس میں لکھا ہے کہ آخری صحبت میں موت کا ذکر کیا تھا درویش و مرید حاضر تھے فرمایا موت ایک پل ہے جس کے ذریعے سے دوست اپنے دوست سے ملتا ہے ۔ اس کے کچھ عرصہ بعد وصالِ حق پا کر اجمیر شریف میں مدفون ہوئے ۔

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد زعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

خواجہ قطب الدین بختیار کعکی رحمۃ اللہ علیہ (۵۰۵ھ تا ۶۳۳ھ)

خواجہ قطب الدین بختیار کعکی (کاکی)ؒ خواجہ بزرگ معین الدین چشتی اجمیریؒ کے خلیفہ اور چشتیہ

---

[1] اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام ، ص ۹

سلسلے کے جلیل القدر بزرگ تھے۔ شیخ محمد نور بخش نے اپنی کتاب سلسلۃ الذہب میں لکھا ہے کہ خواجہ قطب الدینؒ بڑے زبردست ولی تھے اور ہر وقت عبادت اور یاد الہٰی میں مشغول رہتے تھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار میں لکھا ہے کہ ہر روز تین ہزار مرتبہ درود شریف پڑھنے کے بعد آرام کرتے تھے۔ مولد ان کا قصبہ اوش علاقہ ماوراالنہر تھا اسی لیے آپ کے نام کے ساتھ اوشی بھی آتا ہے۔ یعنی خواجہ قطب الدین بختیار ککی اوشیؒ۔ اوش سے آپ سمرقند، بغداد اور اجمیر ہوتے ہوئے دہلی آئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سلطان شمس الدین التتمش (التمش) ہندوستان پر حکمران تھا، اسے حضرت قطب الدین بختیار کاکی سے گہری عقیدت ہو گئی تھی۔

دہلی کی زبان اس وقت برج بھاشا، راجستھانی، پنجابی، ہریانوی اور کھڑی بولی کے عناصر لیے ہوئے تھی کیونکہ یہ شہر ان زبانوں کے مقام اتصال پر واقع تھا۔ اس زبان میں جب فارسی اور عربی کی تھوڑی بہت آمیزش شروع ہوئی اور اس نے ایک نئی شکل اختیار کی تو امیر خسروؒ نے اسے دہلوی کہا۔ اپنے پیر و مرشد حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی طرح خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ بھی مقامی زبان سے یقیناً روشناس ہوں گے کیونکہ اس کے بغیر اس وقت کی مقامی آبادی میں تبلیغ و تلقین کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ایک دفعہ بابا فرید گنج شکرؒ اپنے پیر و مرشد خواجہ بختیار کاکیؒ کو وضو کرا رہے تھے۔ خواجہ بختیار کاکیؒ نے آنکھ جو اوپر کی تو مرید کی آنکھوں پہ پٹی بندھی ہوئی دیکھی۔ جب پیر نے مرید سے وجہ پوچھی تو مرید نے جواب دیا:

"آنکھ آئی ہے"

یہ واقعہ مولانا مبارک المعروف بہ میر خوردؒ نے اسرار الاولیاء میں لکھا ہے جس سے باواؒ صاحب کے ساتھ ساتھ خواجہ بختیارؒ کی ہندی دانی اور ہندی فہمی کا پتہ چلتا ہے۔ اگرچہ ہم خواجہ قطب الدین بختیار ککیؒ کے خواجہ بزرگ معین الدین چشتی اجمیریؒ کی طرح قدیم اردو کے الفاظ جملے اور ابیات پیش کرنے سے قاصر ہیں لیکن ان کی ہندی دانی اور ہندی گوئی سے انکار ممکن نہیں۔ ان کے ملفوظات جو مجموعہ ہشت بہشت میں موجود ہیں اگرچہ فارسی میں ہیں لیکن اس کا امکان ہے

کہ ان میں سے بعض ملفوظات اہلِ مجلس کے لیے ہندی زبان میں کہے گئے ہوں لیکن اس وقت کی علمی زبان فارسی کے پیشِ نظر مرتب نے ان کو ہندی سے فارسی میں ڈھال دیا ہو۔

حضرت سلطان الاولیاء نظام الدین بدایونی سے نقل ہے کہ ایک روز حضرت علی سجستانی قدس سرہ کی خانقاہ میں مجلس سماع قائم تھی۔ صاحب کمال درویش حاضر تھے خواجہ قطب الدین بختیار کعکیؒ بھی ان میں موجود تھے۔

جب قوالوں نے یہ شعر پڑھا:

کشتگانِ خنجر تسلیم را

ہر زماں از غیب جانے دیگر است

تو خواجہ پر ایک حال وارد ہوا اور اسی حال میں جان حق کے سپرد کی۔ مدفن ان کا دہلی میں ہے۔

حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۶۶۴ھ)

خواجہ فرید الدینؒ کا نام مسعود اور لقب فرید الدین تھا۔[1] ان کے والد بزرگوار حضرت جمال الدین سلیمانؒ شہاب الدین غوری بادشاہ دہلی کے زمانے میں کابل سے لاہور آئے تھے۔ وہ کچھ عرصہ قصور اور ملتان میں رہے اور آخر کھوتوال (نزد ملتان) کی سکونت اختیار کر لی۔[2] خواجہ فرید الدینؒ اسی قصبے میں پیدا ہوئے۔ تحصیل علوم ظاہری و باطنی کے لئے کئی سفر کیے اور حضرت قطب الدین بختیار کعکیؒ کے مرید ہو کر اولیائے چشت میں ممتاز مقام حاصل کیا۔[3] رشد و ہدایت کے لیے اجودھن (پاک پتن) کو مرکز بنایا اور یہیں فوت ہوئے۔[4] جہاں آپ

---

[1]: بزم صوفیا از صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۱۲۹

[2]: خزینۃ الاصفیاء از مفتی غلام سرور لاہوری، ص ۲۷۲

[3]: خزینۃ الاصفیاء از مفتی غلام سرور لاہوری، ص ۲۷۳

[4]: منتخب التواریخ میں سن وفات ۶۵۶ لکھا ہے۔

کا مزار آج بھی زیارت گاہ خاص و عام ہے[1]۔

خواجہ فرید الدینؒ کے حالات و ملفوظات پر لکھی جانے والی بعض قدیم کتابوں میں ان کے ہندی اقوال و ملفوظات کا ذکر بھی ملتا ہے۔ مولانا سید مبارک المعروف بہ میر خوردؒ نے، جو سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مرید تھے سیر الاولیاء کے نام سے باوا فریدؒ کے اقوال و ملفوظات پر مشتمل ایک کتاب تالیف کی ہے۔ اس میں ایک مقام پر لکھا ہے کہ باوا صاحب کے ایک مرید شیخ جمال الدین ہانسویؒ کا انتقال ہوا تو شیخ ہانسوی کی خادمہ جو مادر مومناں کہلاتی تھیں شیخ کے خورد سال فرزند برہان الدین صوفیؒ کو لے کر باوا صاحب کی خدمت میں گئیں۔ باوا صاحبؒ نے ان کی بڑی عزت و تکریم کی اور انہیں اپنی بیعت سے مشرف کیا۔ واپسی کے وقت انھوں نے مصلّیٰ، عصاء اور پروانۂ خلافت اس بچے کو بخشا اور فرمایا کہ جس طرح جمال الدین ہانسویؒ میری طرف سے مجاز تھے۔ یہ بھی مجاز ہے اور یہ نصیحت بھی کی کہ کچھ وقت حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خدمت میں بھی گزارا کرو۔ اس پر مادر مومناں نے باوا صاحب کی خدمت عالی میں ہندی زبان میں عرض کیا "خوجا بالا ہے"[2] یعنی خواجہ ابھی بچہ ہے۔ اس بھاری بوجھ کو نہیں اٹھا سکتا۔ اس پر شیخ فریدؒ نے بھی ہندی زبان میں جواب دیا کہ "پونوں کا چاند بھی بالا ہے"[3] یعنی چودھویں کا چاند بھی پہلی رات کو چھوٹا ہی ہوتا ہے اور بتدریج کمال کو پہنچتا ہے۔

سیر الاولیاء ہی میں ایک اور چشتیہ بزرگ شیخ علی صابریؒ ساکن ڈیگری کے متعلق لکھا ہے کہ جس وقت باوا فریدؒ اپنے مختلف مریدوں کو خرقۂ خلافت دے کر رخصت فرما رہے تھے تو شیخ علی صابرؒ نے عرض کی کہ میرے متعلق آپ کا کیا حکم ہے۔ اس پر باوا صاحبؒ نے فرمایا اے صابر "برو بھوگہا خواہی کرد"[4] یعنی اے صابر جا تیری گزر بہت اچھی ہو گی۔

---

[1] : خلاصہ تواریخ مشائخ چشت از مولا بخش نظامی (ذکر خواجہ فرید) اور کتاب انوار الفرید از مسلم نظامی (مکمل حالات کے لیے)

[2] : اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام از مولوی عبدالحق ص ۱۰/۹، بحوالہ سیر الاولیاء از سید مبارک ص ۱۸۲ / ۱۸۵

[3] : پنجاب میں اردو از حافظ محمود شیرانی ص ۲۲۹ / جواہر فریدی ص ۳۰۹ ۔

[4] : سیر الاولیاء از سید مبارک میر خورد (شائع کردہ چرنجی لال مطبوعہ مطبع مجیب ہندی دہلی) ص ۱۸۴/۱۸۵ باوا صاحب کے ہندی الفاظ کے لیے ۔

اس جملے میں بھوکھا کا لفظ ہندی ہے۔ اس قسم کے جملے مولانا محمد علی اصغر چشتیؒ کی مشہور تصنیف جواہر فریدی میں بھی ملتے ہیں ؎۔ اس میں وہ فقرہ بھی ہے جو اس سے پہلے "آنکھ آئی ہے" کے الفاظ میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے حالات میں لکھا جا چکا ہے۔ اس میں یہ واقعہ بھی ہے کہ ایک دفعہ بہاالدین زکریاؒ نے ایک شخص کو جو باوا فریدؒ کے پاس اجودھن جا رہا تھا کہا کہ اس چندرہ کو میری دعا پہنچانا۔ اس نے دعا و سلام پہنچا کر بہاالدین زکریاؒ کا پیغام دیا۔ اس وقت زکریاؒ صاحب کا ایک ڈبہ گم ہو گیا تھا اور وہ کنیز سے پوچھ گچھ کر رہے تھے۔ باوا فرید نے پیغام سن کر کہا کہ میں یہاں سے دیکھ رہا ہوں کہ ڈبہ پلنگ کے پایہ کے نیچے ہے۔ خود وہاں سے نہیں دیکھتا اور مجھ کو چندرہ کہتا ہے۔ جب اس شخص نے واپس جا کر پیغام دیا تو ڈبہ واقعی پلنگ کے پائے کے نیچے سے مل گیا۔ اس میں ہندی لفظ چندرہ کا استعمال ہے۔ ایک اور واقعہ مخدوم جہانیاں کی کتاب سراج الہدایت کے حوالے سے جواہر فریدی میں موجود ہے ایک قافلہ شکر لادے ہوئے چلا جاتا تھا۔ شیخ فریدؒ نے پوچھا کیا ہے اہل قافلہ میں سے کسی نے بہ طریق تمسخر کہا کہ ماش ہے۔ شیخ نے کہا ماش ہی ہو گا۔ قافلہ چلا گیا جب بوریاں کھولیں تو شکر کی بجائے ماش ہی نکلے۔ اس واقعہ میں ماش کا لفظ ہندی ہے۔

جواہر فریدی میں ایک اور حیرت انگیز واقعہ ہے۔ ایک وقت ایک حبشی خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا میرے فرزند نہیں ہیں مجھے فرزند دے۔ شیخ نے کہا ایک دیا، دو دیئے، تین دیے سات تک دے بیٹے کہا۔ شیخ کے پاس ایک طالب علم تھا وہ حیران ہوا کہ شیخ کیا کہتے ہیں۔ بے تاب ہو کر کہنے لگا اے شیخ یہ خدائی کا دعویٰ ہے نہ کہ مشیخیت (یعنی بزرگی و ولایت)۔ شیخ چپ رہے۔ بعد ایک مدت کے وہ حبشی ساتوں بیٹوں کو لے کر شیخ کی خدمت میں آیا۔ طالب علم حیران رہ گیا۔ اس وقت شیخ نے فرمایا اے متعلم اس بندہ مسعود نے چالیس برس تک جو کچھ خدا نے فرمایا وہ کیا۔ آج چالیس برس کے بعد بندہ کے

؎ : جواہر فریدی از مولانا محمد علی اصغر چشتی اُردو ترجمہ شائع کردہ ملک چنن الدین لاہور۔
صفحات ۳۰۹ / ۲۹۱ / ۳۹۱ / ۲۹۲

دل پر جو کچھ گزرتا ہے اور جو کچھ زبان سے نکلتا ہے خدا تعالیٰ اسے پورا کر دیتا ہے۔ وہ متعلم پاؤں پر گر پڑا اور مرید ہوا اور دوسرے وقت میں فرمایا[1] اے بابا شیخ فرید الدین تیرے گھر دھاوا بلجے" اور پھر کہا "اگر باجے مشرق سے مغرب تک باجے"۔ جواہر فریدی میں باوا صاحب سے منسوب جملے "خواہ کھوہ کھا خواہ دوکھا" اور ایک دو تین چار پانچ چھ کے لغت بھی ملتے ہیں۔

اسرار الاولیاء میں لکھا ہے کہ شیخ فرید الدین گنج شکر اپنے ایک دوست کو بھیّا کہا کرتے تھے۔[2] ظاہر ہے یہ ہندی کا لفظ ہے۔ مشہور بزرگ سید برہان الدین المعروف بہ قطب عالمؒ کے ملفوظات جمعات شاہی کے نام سے ہیں۔[3] اس میں باوا فرید گنج شکرؒ کا ایک منظوم قول دیا ہوا ہے۔ جو یہ ہے ؎

اسا کیری یہی سوریت ... جاؤں نائے کہ جاؤں مسیت

ان چھوٹی چھوٹی ہندوی باتوں، اقوال، جملوں یا الفاظ سے اتنی بات تو ضرور ثابت ہو جاتی ہے کہ باوا فریدؒ ہندی زبان جانتے تھے اور بوقت ضرورت اسے استعمال بھی کرتے تھے۔ یہ ہندی زبان وہی تھی جو اس وقت ملتان اور اس کے گرد و نواح کے علاقوں میں بولی جاتی تھی۔ مذکورہ بالا ہندی بیت سے تو یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ باوا صاحبؒ نظم کہنے کی طرف بھی رجحان رکھتے تھے اس لیے ہمیں ان لوگوں کی بات مصدقہ معلوم نہیں ہوتی جو یہ کہتے ہیں کہ باوا صاحبؒ کا سارا کلام ہندی حضرت بہرام فرید ثانیؒ کا ہے جو آپ ہی کی اولاد میں سے گورو نانک کے ہم عصر بزرگ تھے۔ باوا صاحبؒ سے بعض ہندی ابیات کی غلط نسبت سے انکار نہیں ہو سکتا لیکن ان کی ہندی دانی، ہندی گوئی سے انکار ممکن نہیں۔ سخاوت مرزا نے قدیم اُردو کی ایک نایاب بیاض کے حوالے سے باوا فریدؒ کے منظوم ہندی اوراد کا ذکر کیا ہے[4] جن کی تلقین ایک بزرگ شیخ محمد ملتانیؒ المعروف بہ ملتانی بادشاہ اپنے مریدوں کو کیا کرتے

---

[1] : جواہر فریدی، ص ۲۹۲ / ۲۶۰ / [2] : اردوئے قدیم از شمس اللہ قادری، ص ۳

[3] : اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام، ص ۱۱۔

[4] : مضمون قدیم اردو کی ایک نایاب بیاض از سخاوت مرزا رسالہ اُردو، اکتوبر ۱۹۵۰ء، ص ۲۸

یہ بزرگ جنوبی ہند میں سلطنت بہمنیہ کے دور میں ہوئے ہیں :

راستا وہی ہے گوید
پچھا یہی ہے گوید
در دل یہی ضرب کند
تا راستا اینہا تو گوید

یہ منظوم دور قدیم ریختہ کی طرز میں فارسی ہندی الفاظ کی آمیزش لیے ہوئے جملوں میں ہے۔
اس قسم کا ایک اور ریختہ بھی بابا صاحبؒ سے منسوب کیا جاتا ہے اسے مولوی عبدالحق[1] نے اور حافظ محمود شیرانی نے مختلف حوالوں سے نقل کیا ہے[2]۔

وقت سحر وقت مناجات ہے
خیز در آں وقت کہ برکات ہے
نفس مبادا بگوید ترا
خسپ چہ خیزی کہ ابھی رات ہے
با تن تنہا چہ روی زیر زمیں
نیک عمل کن کہ وہی سات ہے
پند شکر گنج بہ دل جاں شنو
ضائع مکن عمر کہ ہیہات ہے

مولوی عبدالحق نے بھولنا شیخ فرید گنج شکر کے نام سے ایک طویل نظم کا بھی ذکر کیا ہے[3] جس کے اشعار اس طرز کے ہیں ؎

پاک رکھ توں دل کو غیر ستی
آج سائیں فرید کا آؤنا ہے

---

[1] اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام، ص ۱۱، ۱۲

[2] پنجاب میں اُردو از حافظ محمود شیرانی ص ۲۳

[3] اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام، ص ۱۱، ۱۲

سخاوت مرزا نے قدیم اردو کی ایک نایاب بیاض کے حوالے سے باوا صاحبؒ کی ایک غزل بھی نقل کی ہے[1] جس میں شطرنج بازی کی اصطلاحات اور علائم میں پند و نصیحت کی باتیں کی گئی ہیں

شطرنج بازی کنتا سوں۔ جو کھلا لوں روں
یک من یک جہت ہوئے کرشہ رخ جوروں
جب شہ آیا مات کوں ہوں رخ کیوں موروں
بازی میری کنتہ کی نت قائم لوروں

مولوی عبدالحق نے مندرجہ ذیل نظم بھی اپنی کتاب "اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" میں دی ہے[2]۔

تن دھونے سے دل جو ہوتا پوک ∴ پیش رَو اصفیا کے ہوتے غوک
ریش سبلت سے گر بڑے ہوتے ∴ بوکڑواں سے نہ کوئی بڑے ہوتے
خاک لانے سے گر خدا پائیں
گائے بیلاں بھی واصلاں ہو جائیں

حامد حسن قادری نے اپنی کتاب داستانِ تاریخ اردو میں لکھا ہے کہ[3] خاکسار راقم بھی باباشکر گنجؒ کی اولاد میں سے ہے۔ راقم کے خاندان میں باباصاحبؒ کا ایک خاص عمل رائج ہے جو قدیم طرز کی اردو میں ہے۔

جواہر فریدی میں مولانا محمد علی اصغر چشتیؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ایک دفعہ اپنی والدہ صاحبہ سے گفتگو کرتے ہوئے باوا صاحبؒ نے کہا تھا[4]۔

فرید دھر سولی سر پنجرے تلیاں توکت کاک
رب اجیوں نہ باہڑے سو دھن ساڈے بھاگ

---

[1] : قدیم اردو کی ایک نایاب بیاض از سخاوت مرزا، رسالہ اردو، اکتوبر ۱۹۵۰ء
[2] : اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام، ص ۱۱ / ۱۲ / ۱۳
[3] : داستانِ تاریخ اردو از حامد حسن قادری (ذکر بابا فریدؒ)
[4] : جواہر فریدی اردو ترجمہ، ص ۲۲۸

سکھ فرقے کے بانی باوا گورونانک تھے۔ گرنتھ اس فرقے کی مذہبی کتاب ہے اس میں باوا فریدؒ سے اس قسم کے کافی اشلوک ملتے ہیں۔ پنڈت جیشی رام شوق نے انھیں الگ کرکے اشلوک فریدی کے نام سے شائع کردیا ہے۔ گرنتھ میں ان اشلوکوں کی موجودگی سے بعض کو یہ غلطی بھی ہوئی ہے کہ یہ اشلوک خود باوا صاحبؒ نے گورونانک کو دیے تھے۔ حالانکہ ان دونوں کے زمانے میں بہت بُعد ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ گورونانک صاحب نے خواجہ فریدؒ کی اولاد میں سے ایک بزرگ خواجہ بہرام المعروف بہ فرید ثانی سے جو ان کے ہم عصر تھے اجودھن کے ایک جنگل میں ملاقات کی تھی جن سے ان کو یہ اشلوک فریدی ملے تھے۔ تفصیل اس کی آگے چل کر فرید ثانی کے حالات میں ملے گی۔[1]

ان شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ باوا فرید گنج شکرؒ اُردوئے قدیم کے پہلے شاعر ہیں۔ بعض محققین نے مسعود سعد سلمان کو جو دورِ غزنوی کے فارسی اور ہندی گو شاعر ہیں قدیم اُردو (ہندی) کا پہلا شاعر بتایا ہے لیکن اس کا کلام دستیاب نہیں[2] مسعود سعد سلمان، ارسلان مسعود حاکم لاہور اور سلطان ابراہیم مسعود ثالث غزنوی کے عہد کے شاعر تھے۔ ان کے والد خواجہ سعد سلمان سلطان مسعود شہید غزنوی کے زمانے میں لاہور میں آکر آباد ہوئے تھے۔ مسعود سعد سلمان یہیں پیدا ہوئے۔ بعض ایرانی تذکرہ نویسوں نے جو انہیں ہمدانی اور جرجانی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، وہ درست نہیں[3] مسعود نے خود ان الفاظ میں اپنا مولد لاہور بتایا ہے۔

"مولدم لاہور و از لاہور دور"

(میری جائے پیدائش لاہور ہے اور میں لاہور سے دور ہوں)۔

مسعود سعد سلمان فارسی کے باکمال شاعر تھے مشہور صوفی شاعر حکیم سنائیؒ نے، جو حدیقۃ الحقیقت کے مصنف ہیں ان کے فارسی دیوان کو مرتب کیا ہے۔ فارسی کے علاوہ

---

[1]: دیکھئے اشلوک فریدی از پنڈت جیشی رام شوق (مکمل)

[2]: اردو شہ پارے از محی الدین قادری زور، ص ۹

[3]: آبِ کوثر از شیخ محمد اکرام، ص، ۲۸

ان کا ایک ہندی دیوان بھی کہا جاتا ہے لیکن یہ نایاب ہے۔ محمد عوفی نے لباب الالباب اور امیر خسرو نے دیباچہ غرۃ الکمال میں اس کا ذکر کیا ہے[1] محمد عوفی کہتے ہیں کہ مسعود سعد سلمان کے تین دیوان ہیں" ایک تازی' ایک فارسی اور ایک ہندوی" (ترجمہ فارسی) امیر خسرو کہتے ہیں کہ اس سے پہلے شاہان سخن میں سے کسی کے تین دیوان نہیں تھے مگر میرے کہ میں مملکت کلام کا خسرو ہوں۔ اگرچہ مسعود سلمان کے تین دیوان ہیں لیکن وہ تین دیوان، عربی' فارسی اور ہندوی زبان میں ہیں صرف فارسی میں کسی نے میرے سوا سخن کو تین قسم نہیں کیا (فارسی سے ترجمہ) ان بیانات کی روشنی میں ہمیں یہ تسلیم کرنے میں عذر نہیں ہونا چاہیے کہ مسعود سلمان کا ایک ہندوی دیوان بھی تھا جو اگرچہ دستیاب نہیں تو الگ بات ہے۔

حافظ محمود شیرانی پنجاب میں اُردو میں لکھتے ہیں کہ مسعود سعد سلمان برابر ساٹھ سال تک ہندوستان میں رہے، یہیں پیدا ہوئے۔ یہیں رہے۔ لاہور ان کا وطن تھا اور جس محبت کے ساتھ وہ اپنے وطن کا تذکرہ کرتے ہیں وہ ان کے فارسی اشعار سے ظاہر ہے۔ اس لیے اگر انھوں نے اپنے وطن کی زبان میں شعر کہے ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں[2]

مسعود سعد سلمان نے اپنی فارسی شاعری میں بعض ایسے اصناف سخن استعمال کیے ہیں جو ہندی اور پنجابی شاعری کے ساتھ خصوصیت رکھتے ہیں مثلاً بارہ ماسہ یا دوازدہ ماہہ جس میں ہندوستانی سال کے بارہ ماہ کی موسمی اور فضائی خصوصیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے دل مضطر کا حال بیان کیا جاتا ہے۔ اسے بکٹ کہانی بھی کہتے ہیں۔ عام طور پر اس میں کسی فراق زدہ عورت کی طرف سے اپنے شوہر کو خطاب کیا جاتا ہے لیکن مسعود سعد سلمان نے جو بارہ ماسے (دوازدہ ماہے) فارسی میں لکھے ہیں ان میں اس روایت کو بدل دیا گیا ہے

---

[1]: پنجاب میں اُردو از حافظ محمود شیرانی، ص ۳۷ / ۳۸

[2]: پنجاب میں اُردو، ص ۳۷ / ۳۸

اور ان میں مہینوں کی خوش گواری کا ذکر کرکے شراب کی اور عیش کی دعوت دی گئی ہے اور ارسلان بن مسعود کی مدح بھی کی گئی ہے۔ فارسی میں اس صنف کو بارہ ماسہ کی جگہ شہوریہ کا نام دیا گیا ہے۔ اس طرح ایامیہ اور سبوعیہ غزلیں بھی جو فارسی مہینوں کے دنوں اور ہفتوں پر لکھی گئی ہیں ہندی شاعری کے اثرات کا پتہ دیتی ہیں۔ اس طرز کی شاعری فارسی میں پہلے موجود نہ تھی یہ مسعود سعد سلمان کی جدت فکر کا نتیجہ ہے جس کے محرکات میں ہندی شاعری کا دخل ضرور ہے۔ فارسی میں ہندی محاورہ کا استعمال ان کے اس شعر میں دیکھئے۔

چو رعد ز ابر غرّید کوس محمودی
بر آمد از پس دیوار حصن مارا مار

فارسی شعر میں مارا مار کا پیوند اس ریختہ کی طرف اشارہ کرتا ہے جس میں فارسی اور ہندی الفاظ کی آمیزش ہوتی ہے اور جسے امیر خسروؒ نے باقاعدہ فنّی حیثیت سے اختیار کیا ہے۔ اس طرح مسعود سلمان نے ہندوستان کی برسات پر جو شعر لکھے ہیں ان سے مقامی فضا اور ماحول سے ان کی ذہنی مناسبت و مطابقت کا پتہ چلتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم نے ان اشعار کو اپنے تبصرے کے ساتھ اورینٹل کالج میگزین لاہور میں شائع کرایا ہے[۱]۔ حافظ محمود شیرانی نے بھی اس میگزین میں آٹھویں اور نویں صدی ہجری کی فارسی تصنیفات سے اُردو کی شہادت کے عنوان سے مضمون لکھتے ہوئے[۲] مسعود سعد سلمان کے شعروں میں سے ہندی الفاظ و محاورات کی نشان دہی کی ہے مثلاً ایک لفظ کت ہے۔ لغت میں اس کا مطلب ہندوؤں کا تخت ہے۔ یہی کتّ، کھٹ سے ہوتا ہوا کھاٹ بن گیا ہے۔ اس طرح لفظ برشکال بھی دیکھنے میں آتا ہے جو ہندی الفاظ برش اور کال سے مرکب ہے اور جس کے معنی برسات کے موسم کے ہیں۔

---

۱ : مضمون ہندوستان کی برسات پر مسعود سعد سلمان کے شعر از ڈاکٹر سید عبداللہ اورینٹل کالج میگزین ۱۹۳۴ء۔ ص ۱۲۸

۲ : اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۲۹، ص ۱۱۵

ان اندرونی اور بیرونی شہادتوں سے اگرچہ یہ یقین ہو جاتا ہے کہ مسعود سعد سلمان نے قدیم اُردو (ہندوی) میں شعر کہے ہوں گے اور دیوان بھی مرتب کیا ہو گا لیکن اس کے آج دستیاب نہ ہو سکنے کی بنا پر یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ مسعود سعد سلمان اگرچہ ہندی کے اوّلین معلوم مسلمان شاعر ہیں لیکن باوا مسعود گنج شکرؒ پہلے شخص ہیں جن کا ہندوی اور ریختہ کلام دستیاب ہے[۱]۔ ان کی ہندوی گوئی کی شہادت فاضل شارح اکھروٹ (تصنیف ملک محمد جائسی) کے بیان سے بھی ہوتی ہے جو کہتے ہیں کہ:

"گمان نکند کہ ہیچ اولیاء اللہ بزبان ہندی تکلّم نہ کردہ زیرا کہ اوّل از جمیع اولیا قطب الاقطاب خواجہ بزرگ معین الحق والملۃ والدین قدس سرہٗ بدیں زبان سخن فرمودہ بعد از اں حضرت خواجہ گنج شکر قدس سرہٗ۔ و حضرت خواجہ گنج شکرؒ در زبان ہندی و پنجابی بعضے از اشعار نظم فرمودہ چنانکہ در مردم مشہور اند از دوہرہ و سورٹھ۔"

ترجمہ: یہ گمان نہ کریں کہ اولیاء اللہ میں سے کسی نے ہندی زبان میں کلام نہیں فرمایا کیونکہ جملہ اولیاء میں سے پہلے قطب الاقطاب خواجہ بزرگ معین الحق والدین قدس سرہٗ (یعنی خواجہ معین الدین چشتیؒ) نے اس زبان میں کلام کیا اور ان کے بعد خواجہ گنج شکر قدس سرہٗ نے۔ اور خواجہ گنج شکر نے ہندی اور پنجابی زبان میں بعض شعر نظم کیے ہیں جیسا کہ عوام میں دوہڑے اور سورٹھ ان سے مشہور ہیں۔"

---

[۱]: باوا فرید الدین گنج شکر کے مزید ہندی کلام کے لیے دیکھیے

(و) اشلوک فریدی از پنڈت جینتی رام شوق (مکمل)

(ب) اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام از مولوی عبدالحق ص ۹ تا ۱۳

شیخ حمید الدین صوفی ناگوری رحمۃ اللہ علیہ (۵۷۰ھ تا ۶۷۳ھ)

شیخ حمید الدین صوفی ناگوریؒ جن کا لقب سلطان التارکین اور جن کی کنیت ابو احمد تھی، راجستھان کے قصبہ ناگور سے تعلق رکھتے تھے۔ اسی لیے ناگوری کہلاتے تھے۔ وہ خواجہ بزرگ خواجہ معین الدین چشتیؒ کے خلفاء میں سے تھے۔ ان کے زمانے میں ان کے ہم نام ناگور ہی کے ایک بزرگ اور تھے وہ قاضی حمید الدین ناگوریؒ کہلاتے تھے[1] اور سلسلہ سہروردیہ سے نسبت رکھتے تھے البتہ خواجہ قطب الدین بختیار کعکیؒ کے مصاحب بھی تھے ان کا زمانہ ۵۱۵ء تا ۶۲۵ء کا ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار میں لکھتے ہیں کہ شیخ حمید الدین صوفی ناگوریؒ اپنی طویل العمری کے باعث حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی دہلویؒ کے زمانے تک موجود تھے اور حضرت محبوب الٰہیؒ نے صوفی ناگوری کی تصانیف سے ان کے ملفوظات اخذ کر کے خود اپنے ہاتھ سے لکھے تھے خواجہ فرید الدین گنج شکر سے ان کا خاص محبتی تعلق تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ یہ دونوں بزرگ ایک مجلس میں موجود تھے دوران گفتگو یہ طے پایا کہ دونوں میں سے جو پہلے مرجائے وہ دوسرے کو بتائے کہ اس پر کیا بیتی۔ باوا صاحبؒ پہلے فوت ہو گئے۔ صوفی ناگوری کچھ عرصہ بعد جب اجودھن آئے تو انھیں یہ بات یاد آئی۔ ظاہری ملاقات روحانی میں کچھ شرعی قدغن دیکھتے ہوئے انھوں نے کاغذ قلم قبر مبارک پر رکھ دیا اور چند لمحوں کے لیے مزار کا دروازہ بند کر دیا۔ جب دروازہ کھولا تو باوا صاحبؒ نے بقلم خود یہ شعر لکھا ہوا تھا جس میں ان کے سوال یا استفسار کا جواب پوشیدہ ہے۔

جملہ فنون شیخ نہ ارزد بہ نیم خس
راحت بہ دل رساں کہ ہمیں مشرب است و بس

---

[1] دیکھیے اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار از شیخ عبدالحق محدث دہلوی اردو ترجمہ شائع کردہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی ص ۶۷ (حمید الدین صوفی کے لیے) ص ۸۵ (قاضی حمید الدین ناگوری کے لیے)

صوفی ناگوریؒ کے فارسی مکتوبات بھی ہیں اور ان کے ہندوی جملے بھی دستیاب ہوئے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے کتاب اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام میں کتاب سرور الصدور کے حوالے سے ان کا تعارف کرایا ہے[1] اور ایک کتاب خزینہ رحمت سے ان کا ایک واقعہ بھی نقل کیا ہے جس میں ناگوری صاحبؒ اپنے والد بزرگوار کے استفسار پر کہتے ہیں۔

"ہاں بابا کچھ کچھ"

اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ان قدیم بزرگوں کے گھروں اور گفتگو میں ہندوی (قدیم اُردو) کا تھوڑا بہت رواج ضرور تھا۔ کتاب سرور الصدور سے جو عبارت مولوی عبدالحق نے نقل کی ہے[2] اس میں لفظ کھٹ بھی ہے۔ یہ ہندی لفظ ہے اسے کھاٹ بھی کہتے ہیں یعنی تخت یا چارپائی۔ شیخ بزرگ شیخ حمید الدین ناگوری خود کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میں اپنی دادی کے پاس تھا۔ وہ کھاٹ پر بیٹھی تھیں، میں ابھی چھوٹا تھا انھوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور ہندی زبان میں کہا۔

"تمھارا دادا کون ہے" (کتاب کی عبارت ہے جدّ تو کیست)

میں نے کہا۔ بی بی کیسے۔ (چگو نہ فارسی میں ہے)

کہنے لگیں

"تمھارے اجداد سے کوئی شخص سوائے تمھارے پیغمبر کے بڑا نہیں"

فارسی عبارت یہ ہے

(از جد تو ہیچ کس بجز پیغمبرش بزرگ نیست)

اس گفتگو سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ حمید الدین صوفیؒ کے گھر میں مقامی زبان بولی جاتی تھی اور اسے شیخ بچپن میں سمجھتے تھے۔ جب دادی نے ہندی زبان میں پوچھا کہ تمھارا دادا کون ہے تو لازماً جواب میں ہندی زبان ہی استعمال ہوئی ہوگی۔ مولف کتاب سرور الصدور

---

[1] اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام، ص ۱۳ / ۱۴

[2] اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام، ص ۱۴

نے یہ کہہ کر کہ دادی نے ہندی زبان میں پوچھا سوال ہندی میں نہیں فارسی میں دیا ہے یعنی جد تو کیست (تمہارا دادا کون ہے) جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں لکھی جانے والی کتابوں میں کسی بزرگ کی ہندی بول چال کو اس کی اصلی زبان میں نہیں بلکہ اس دور کی علمی زبان فارسی میں ترجمہ کر کے دے دیا جاتا تھا۔ اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ قدیم بزرگوں کے وہ ملفوظات جو کتابوں میں فارسی زبان میں ملتے ہیں کلی یا جزوی طور پر ہندی میں بھی ہو سکتے ہیں۔

خواجہ علی احمد صابر کلیر شریفی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۶۹۰ھ)

خواجہ علی احمد صابرؒ شیخ فرید الدین گنج شکرؒ کے داماد بھی تھے اور بھانجے بھی۔ مرشد کے حکم سے کلیر شریف (بھارت) میں مرکز تبلیغ و ہدایت قائم کیا، اور اپنی خاص شناخت کی بنا پر ان کا مسلک چشتیہ صابریہ کے نام سے برصغیر اور اس کے باہر شہرت عام اور قبولیت دوام کا باعث بنا۔

شیخ فرید الدین گنج شکرؒ کے مندرجہ ذیل ہندوی کلام سے جو انھوں نے خواجہ علی احمد صابرؒ کو کلیر شریف بھیجا تھا پتہ چلتا ہے کہ خواجہ صابرؒ بھی ہندوی سے آشنا تھے اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ مقامی آبادی میں تلقین و رشد کا کام نہیں کر سکتے تھے۔ ہوا یوں کہ جب خواجہ صابرؒ کلیر شریف پہنچے تو وہاں کے لوگوں کے متعلق کچھ شکایتیں لکھیں۔ جب یہ سلسلہ اور بڑھا تو باوا صاحبؒ نے خواجہ صابرؒ کو جو کچھ لکھا اس میں یہ ہندوی فقرہ بھی تھا[1]

" خواہ کھوہ کھاہ خواہ دوہ کھاہ "

اس سے مراد یہ ہے کہ خواہ بہ جبر و اکراہ اس سے نفع اٹھاؤ اور خواہ بہ لطف و رحمت سیر الاولیاء میں مولانا سید مبارک المعروف بہ میر خوردؒ نے ایک واقعہ شیخ علی صابر ساکن ڈیگری کے متعلق لکھا ہے جس میں باوا صاحب نے انھیں ہندی زبان میں کہا تھا "بر وجھو گا خواہی کرد" جاؤ تم عیش و عشرت کی زندگی گزارو گے۔ مولانا عبدالحق محدث دہلوی نے ان شیخ صابریؒ کے متعلق کہا ہے[2] کہ یہ وہی صابر ہیں جنھیں علی احمد صابر کہتے

---

[1]: جواہر فریدی از مولانا اصغر علی چشتی، ص ۲۹۰ / ۲۹۲ اردو ترجمہ

[2]: اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار از شیخ عبدالحق محدث دہلوی (اردو ترجمہ، کراچی، ص ۱۵۴، ۵۵)

ہیں اور جو شیخ گنج شکرؒ کے داماد اور خلیفہ تھے اور جن کا مزار کلیر شریف میں ہے۔ مولانا حیران ہیں کہ سیر الاولیاء جیسی کتاب میں شیخ صابر ساکن ڈیگڑیؒ کا تو ذکر ہو لیکن شیخ علی احمد صابرؒ کا ذکر نہ ہو جو اتنے اہم چشتیہ بزرگ ہیں کہ شیخ عبدالقدوسؒ گنگوہی کا سلسلہ ان تک پہنچتا ہے اور باوا فرید سے ان کا قریبی رشتہ ہے اور صابری سلسلہ ان سے باقاعدہ منسوب ہے۔ مولانا محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ علی احمد صابرؒ جیسے بزرگ کا سیر الاولیاء سے حذف کر دینا تعجب سے خالی نہیں اور پھر خود ہی کہتے ہیں کہ ممکن ہے شیخ صابر سے مراد شیخ علی صابرؒ ہی ہوں۔ واللہ اعلم۔

شیخ صوفی بدھنی رحمۃ اللہ علیہ (۷۰۴ھ)

شیخ صوفی بدھنی کیتھل (ضلع پانی پت کرنال) کے ایک چشتی صوفی تھے[1] وہ اتنے تارک الدنیا تھے کہ بدن پر کپڑے نہ ہونے کے برابر ہوتے تھے۔ حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ کی خیر المجالس میں ہے کہ صوفی بدھنی کو عبادت کا شوق بڑا تھا۔ مسجد میں رہتے اور شب و روز محراب کے سامنے نماز پڑھتے رہتے۔ اس کے سوا کچھ اور نہ کرتے۔ ایک دفعہ آپ کے پاس کچھ عالم ظواہر آئے۔ شیخ بدھنیؒ نے ان سے پوچھا کیا جنت میں نماز ہوگی۔ عالموں نے کہا جنت دراصل دار الجزا (یعنی بدلوں کی جگہ) ہے جہاں کھانے پینے اور عیش کے سوا کچھ نہ ہوگا عبادتیں صرف دنیا میں کی جاتی ہیں۔ صوفی بدھنیؒ نے یہ سن کر کہا جس جنت میں نماز نہ ہو اس سے میرا کیا واسطہ۔ اس کے بعد ہندی زبان میں ایک ناقابل تحریر لفظ ان سے کہا[2] جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ بدھنیؒ اپنی عام گفتگو میں ہندوی استعمال کرتے تھے۔

---

[1] : اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار از شیخ عبدالحق محدث دہلوی اردو ترجمہ مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی، ص ۱۷۲

[2] : اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار۔ ص ۱۷۳

شیخ صوفی بدھنیؒ کے متعلق خیر المجالس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ حضرت فریدالدین گنج شکرؒ کے زمانے میں موجود تھے لوگوں میں یہ بھی مشہور ہے کہ ایک موقع پر حضرت قطب الدین بختیار کعکیؒ اور صوفی بدھنی دوسرے لوگوں کے ساتھ چنگیزیوں کے ہاتھوں قید ہوگئے۔ ایک دن سارے قیدی بہت بھوکے اور پیاسے تھے خواجہ قطب الدین بختیار کعکیؒ اپنی بغل سے روٹیاں نکال نکال کر قیدیوں کو دیتے رہے اور وہ صوفی بدھنیؒ کے لوٹے سے پانی پیتے رہے یہاں تک کہ سب سیر اور سیراب ہوگئے۔ اس دن سے خواجہ قطب الدین بختیار لقب کعکیؒ (کاکی) یعنی روٹیوں والے اور یہ صوفی بدھنی کے لقب سے یعنی ٹوٹی دار لوٹے والے مشہور ہوگئے[۱]۔ کیونکہ بدھنی ہندی میں ٹوٹی دار لوٹے کو کہتے ہیں اس واقعہ سے صوفی بدھنی کی خواجہ قطب الدین بختیار سے ہم صحبتی اور ان کے چشتیہ سلسلے سے منسلکی کا ایک پہلو ضرور ہے۔ بدھنی کا لفظ بھی ان کے نام کا جزء ہونے کے اعتبار سے ان کی ہندوی سے رغبت اور تعلق کا صاف پتہ دیتا ہے۔

شیخ شرف الدین بو علی قلندر پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ

(۶۵۲ھ تا ۷۲۴ھ)

شیخ شرف الدین جو عام طور پر بو علی قلندرؒ کے نام سے متعارف ہیں، ایک قلندرانہ شان کے بزرگ تھے۔ ان کے سلسلہ مریدی کے بارے میں شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اپنی تصنیف اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار میں لکھا ہے[۲] کہ یہ تو معلوم نہ ہو سکا کہ کس کے مرید تھے البتہ لوگ کہتے ہیں کہ خواجہ قطب الدین بختیار کعکیؒ کے مرید تھے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے بیعت تھے۔ مولانا محمد علی اصغر چشتیؒ نے اپنی تصنیف جواہر فریدی میں انہیں نظام الدین اولیاءؒ

---

[۱] : اخبار الاخیار فی تذکرہ الابرار، ص ۱۷۳ / ۱۷۴

[۲] ، اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار (کراچی ایڈیشن)، ص ۲۷۸

ہی کا مرید کہا ہے ۔ لکھتے ہیں[1] کہ ایک شخص نے حضرت قطب عالمؒ سے پوچھا کہ شرف الدینؒ کس کے مرید تھے فرمایا کہ سلطان المشائخ شیخ نظام الدین کے مرید تھے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ ان کی ارادت کی وجہ کیا تھی تو جواب میں کہنے لگے کہ ایک وقت شیخ شرف الدین کے دل میں خیال آیا کہ کسی ایسے کا مرید ہو جاؤں جو آسمان سے تصرف رکھتا ہو۔ اس قصد سے اوّل آسمان پر گئے تو دیکھا کہ سلطان المشائخ بوریا بچھائے نماز پڑھ رہے ہیں ان کو دیکھ کر وہاں سے پھرے۔ دوسرے روز دوسرے آسمان پر گئے پھر یہی دیکھا۔ تیسرے اور چوتھے روز تیسرے اور چوتھے آسمان پر یہی منظر دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ شیخ جس مصلیٰ پر نماز پڑھ رہے ہیں اس کے ساتھ ایک اور سفید مصلیٰ بچھا ہوا ہے جو خالی ہے پوچھا کہ یہ کس کا ہے کہا کہ یہ نور قطب عالمؒ کا ہے پوچھا وہ کہاں ہے جواب ملا ابھی وہ عالم وجود میں نہیں آئے جب آئیں گے تو اس مصلے پر نماز پڑھیں گے۔ پانچویں چھٹے اور ساتویں روز پانچویں چھٹے او ساتویں آسمان پر گئے تو یہی منظر دیکھا کہ شیخ نماز پڑھ رہے ہیں اور ایک سفید مصلیٰ خالی پڑا ہے پوچھا یہ کس کا ہے۔ کہا شیخ بدیع الدین المعروف بہ شاہ مدار کا ہے۔ پوچھا وہ کہاں ہیں جواب ملا کہ ابھی انھوں نے وجود ظاہری نہیں پایا جب پائیں گے تو اس مصلے پر نماز پڑھیں گے۔ پھر شیخ شرف الدین پھرے اور اگلے روز ستر ہزار ظلماتی حجابات طے کئے تو اس کے پار دیکھا کہ سلطان المشائخ سفید مصلیٰ بچھائے نماز پڑھ رہے ہیں اور الٹی طرف ایک صف کے فرق سے ابوالفتح رکن الدینؒ نواسہ شیخ بہاؤالدین زکریاؒ ملتانی نماز پڑھ رہے ہیں۔ وہاں سے پھرے اور اگلے روز اس کے آگے ستر ہزار نورانی حجابات طے کئے تو وہاں دیکھا کہ شیخ المشائخ تنہا نماز پڑھ رہے ہیں۔ سچ کہا ہے اقبال مرحوم نے ؎

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفٰی سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

---

[1] جواہر فریدی اردو ترجمہ۔ ص ۳۱۴ / ۳۱۵

آخر شرف الدینؒ نے سارا حال سلطان المشائخ کو سنایا۔ سلطان المشائخ مولانا نظام الدین اولیاءؒ نے فرمایا تم بھی وہ جنگل دیکھ آئے ہو۔ اور اس منزل پر پہنچے ہو تم کو کسی بات کی کیا حاجت ہے۔ شیخ شرف الدینؒ نے انکار کا اشارہ پانے کے بعد اگلے روز اپنے بیٹے کے ذریعے درخواست بھیجی کہ مرید کر لیں۔ لیکن سلطان المشائخ نے پھر بھی وہی جواب دیا۔ انکار سننے کے بعد شیخ شرف الدینؒ نے کہا کہ یہ بیس حجاب جو نور کے رہ گئے تھے۔ وہاں پیر کے وسیلے کے بغیر گزر نہیں۔ اس پر سلطان المشائخ نے فرمایا کہ جب میں عصر کے وقت دریا کنارے جاؤں گا تو وہاں بیعت کروں گا۔ جب وقت آیا سلطان المشائخ گئے اور کلاہ سر سے اتاری اور پانی پر رکھ دی وہ غائب ہو گئی چند یار ہمراہ تھے متعجب ہوئے۔ بعد ازاں سلطان المشائخ نے اپنا ہاتھ پانی میں ڈالا اور شجرہ شریف پڑھا اور شیخ شرف الدینؒ کو یاد کیا اور انہیں بیعت کیا[1]۔ یہ واقعہ امیر خسروؒ نے اپنے شیخ سے سنا تھا۔ جو اہر فریدی کے مصنف نے نقل کیا ہے۔ اس سے شیخ شرف الدین بو علی قلندر کی نسبت چشتیہ کا صاف اور واضح ثبوت ملتا ہے اور جن لوگوں کا خیال ہے کہ قلندر کسی کے بیعت نہیں ہوتے وہ صحیح نہیں۔

اسرارِ محبت را ہر دل نبود قابل
دُر نیست بہ ہر دریا، زر نیست بہ ہر کانے

حافظ محمود شیرانی نے اپنی تصنیف پنجاب میں اُردو میں لکھا ہے[2] کہ شرف الدین بو علی قلندر پانی پتی کے سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے ہندی دوہوں میں مشاعرات بھی ہوتے تھے اس سے دونوں بزرگوں کی ہندی دانی اور ہندی سے شغف کا صاف اور صادق ثبوت بہم پہنچتا ہے۔ مولوی عبدالحق نے ''اُردو کی ابتدا میں صوفیائے

---

[1] یہ نیلگوں فضا جسے کہتے ہیں آسماں
بالائے سر رہا تو ہے نام اس کا آسماں
ہمت ہو پَر کشا تو حقیقت میں کچھ نہیں
زیر پر آگیا تو یہی آسمان سے زمیں (اقبال)

[2] پنجاب میں اُردو، ص ۱۵۰

کرام کا کام" میں فرہنگ آصفیہ کے حوالے سے لکھا ہے[۱] کہ ساتویں صدی ہجری میں جس زبان کا رواج تھا اس کی کیفیت اس دوہے سے معلوم ہوسکتی ہے جو حضرت شرف الدین بوعلی قلندرؒ پانی پتی کا ہے۔

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے
بدھنا ایسی رین کو بھور کدھی نہ ہوئے

اس مضمون کو قلندر صاحب نے خود ہی فارسی میں یوں ادا کیا ہے۔

من شنیدم یار من فردا رود راہ شتاب
یا الہٰی تا قیامت بر نیاید آفتاب

سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الہٰیؒ (متوفی ۷۲۵ھ)

سلطان المشائخ محبوب الہٰیؒ کا نام شیخ نظام الدین محمد تھا۔ وہ بدایوں صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کے رہنے والے تھے۔ سلطان المشائخ، محبوب الہٰی اور اولیاء ان کے لقب تھے۔ وہ بابا فرید الدین گنج شکرؒ کے خلیفہ اعظم تھے اور اپنے تبلیغی اور روحانی اثرات کے اعتبار سے صوفیائے چشت بلکہ جملہ صوفیائے کرام ہند میں اہم اور مرکزی حیثیت کے حامل تھے۔ ان سے نہ صرف چشتیہ نظامیہ سلسلہ شروع ہوا بلکہ ان کے خلفاء اور مریدین کی بہت بڑی تعداد کے سبب برصغیر میں مذہب اسلام اور مسلک چشتیہ کو بڑا فروغ حاصل ہوا اور ملک کے کونے کونے میں یہ نور پھیل گیا۔ حضرت امیر خسروؒ اور حضرت امیر حسن سنجریؒ جیسے عظیم فارسی شاعر جنھوں نے ہندوی اور ریختہ میں شعر بھی کہے ہیں انہی کے مرید تھے۔ وہ شعر کا خود بھی بڑا پیارا ذوق رکھتے تھے۔ فارسی عربی اور ہندوی تینوں زبانوں سے واقف تھے۔ فارسی کے ساتھ ہندوی شاعری کا بھی شوق تھا۔ حضرت نصیر الدین

---

[۱] اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام، ص ۱۵

چراغ دہلویؒ کی خیر المجالس میں لکھا ہے کہ آپ مجلس سماع میں فارسی کے علاوہ ہندوی قوالی بھی سنتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شیخ شرف الدین بو علی قلندر پانی پتی سے ان کے ہندی زبان میں مشاعرات بھی ہوتے تھے۔ امیر خسروؒ کو ہندی زبان اور ہندی شاعری سے جس قدر شغف تھا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے پیر و مرشد سلطان المشائخ بھی اس کا اعلیٰ ذوق رکھتے ہوں گے۔ ان بزرگوں کی اس قسم کی شعوری یا لاشعوری کوششوں سے برصغیر میں اردو کی قدیم شکل کے عام ہونے میں بڑی مدد ملی ہے۔ یاد رہے کہ اس زمانے میں ہی ایک اور شیخ نظام الدینؒ تھے وہ ابو المؤید کہلاتے تھے۔ ان کا سن وفات بھی ۶۲۵ھ بتایا جاتا ہے خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے ہم زمانہ تھے حضرت نظام الدین اولیاء سے ان کو خلط ملط نہیں کرنا چاہیئے۔

شیخ جمال الدین ہانسوی رحمۃ اللہ علیہ (۶۲۸ تا ۷۰۰ھ)

شیخ جمال الدین ہانسویؒ امام اعظم امام ابو حنیفہؒ کی اولاد میں سے تھے۔ شیخ فرید الدین گنج شکرؒ کے ممتاز خلیفہ اور بہت بڑے خطیب اور مقرر تھے۔ شیخ عبد الحق محدثؒ نے اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار میں لکھا[1] ہے کہ شیخ فریدؒ ہانسی میں بارہ برس تک شیخ جمال الدینؒ کے ساتھ رہے ہیں۔ شیخ فریدؒ نے ان کے متعلق کہا ہے کہ "جمال ہمارا جمال ہے"۔ سنا ہے شیخ فریدؒ نے یہ آرزو بھی کی تھی کہ "جمال تمہارے گرد طواف کروں"۔ شیخ فرید کو وہ کس قدر عزیز تھے اس کا پتہ اس بات سے چلتا ہے کہ شیخ فریدؒ جس کو خلافت دیتے اسے شیخ جمالؒ کے پاس بھیج دیتے اگر شیخ جمالؒ اس کو قبول کر لیتے تو اس کی خلافت درست سمجھی جاتی۔ اگر شیخ جمالؒ انکار کر دیتے تو شیخ فریدؒ دوبارہ خلافت نہ دیتے اور کہہ دیتے کہ "جمال کے پھاڑے کو فرید سی نہیں سکتا"۔ یہ گفتگو فارسی میں بھی

---

[1] اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار از شیخ عبد الحق محدث دہلوی (از اردو ترجمہ، مدینہ پبلشنگ کراچی)، ص ۱۰۵

[2] اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار (اردو ترجمہ مدینہ، پبلشنگ کراچی)، ص ۱۵۱

ہو سکتی ہے اور ہندی میں ہونے کا امکان بھی ہے۔ مولانا سید مبارک میر خوردؒ سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مصاحب خاص اور مرید تھے انھوں نے سیر الاولیاء میں جہاں خواجہ فریدؒ کے ہندی اقوال کا ذکر کیا ہے[1] وہاں شیخ جمال الدین ہانسویؒ کی ہندی دانی کا پتہ بھی دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ شیخ جمال الدین ہانسویؒ کی ایک خادمہ تھی جو بہت ہی صالحہ تھیں۔ شیخ فریدؒ انہیں مادر مومناں کہا کرتے تھے جب وہ شیخ جمال الدین ہانسویؒ کا عصا اور مصلیٰ ان کی موت کے بعد شیخ الشیوخ حضرت فرید الدینؒ کے پاس لائیں تو انھوں نے ان کو شیخ جمال الدین ہانسوی کے چھوٹے بیٹے برہان الدین صوفیؒ کے سپرد کرتے ہوئے ان کو خلیفہ مجاز بنا دیا جس پر مادر مومناں نے ہندی میں کہا کہ "خوجا بالا ہے" جس کے جواب میں شیخ الشیوخ باوا صاحبؒ نے ہندی میں فرمایا "پونوں کا چاند بھی بالا ہے" اس ہندی گفتگو سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت جمال الدین ہانسوی کے گھر والے بھی ہندی آشنا تھے اور وہ خود بھی۔

حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۷۲۵ھ)

جناب امیر خسروؒ بمقام پٹیالی ضلع ایٹہ (صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ) میں پیدا ہوئے۔ سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء کے مرید و خلیفہ تھے[2] جن کی سرپرستی، تربیت اور محبت و شفقت نے انہیں علم و عرفان کے درجہ کمال تک پہنچا دیا تھا وہ فن شعر و موسیقی میں بھی اعلیٰ مقام رکھتے تھے۔ ان کی موسیقی دانی کے متعلق محمد حسین آزاد نے آب حیات میں لکھا ہے[3] کہ "موسیقی میں ان کی طبیعت ایک بین تھی کہ بن بجائے پڑی بجتی تھی۔ انھوں نے دھرپت کی جگہ قول و قلبانہ بنا کر بہت سے راگ ایجاد کیے کہ ان میں سے اکثر گیت آج تک ہندوستان کے زن و مرد کی زبان پر ہیں۔

---

[1]: سیر الاولیاء، ص ۱۸۲ / ۱۸۵

[2]: اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار از عبد الحق محدث دہلوی، ص ۹۹ (اردو ترجمہ)

[3]: آب حیات، ص ۷۴

بہار راگ اور بسنت کے میلے نے انہی کی طبیعت سے رنگ پکڑا۔ بین کو مختصر کرکے ستار بھی انھوں نے ہی نکالا ہے"۔

ہندوستان کے فارسی گو شاعروں میں بھی ان کا مقام منفرد اور یکتا تھا۔ ایران کے نقادوں اور شاعروں نے عام طور پر ہندوستان کے فارسی شاعروں کو ثقاہت کی سند نہیں دی لیکن امیر خسروؒ کی قادر الکلامی اور زبان دانی کا تقریبًا سب نے اعتراف کیا ہے۔ فارسی کے علاوہ امیر خسروؒ سنسکرت اور ہندی کے بھی عالم تھے۔ قدیم ریختہ میں بھی جس کی تشکیل ہندی اور فارسی الفاظ اور مصرعوں کی آمیزش اور پیوندکاری سے ہوئی ہے ان کا متفرق کلام ملتا ہے۔ میر تقی میر نے نکات الشعراء میں اور قیام الدین قائم نے مخزن نکات میں ان کے یہ دو شعر نقل کیے ہیں[1]

زرگر پسرے جو ماہ پارا ۔۔۔ کچھ گھڑیے سنواریے پکارا

نقدِ دل من گرفت و بشکست ۔۔۔ پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

آب حیات میں ریختہ طرز کی ایک پوری غزل ان کے نام سے ہے جس کا مطلع یہ ہے[2]

ز حالِ مسکیں مکن تغافل و رائے نیناں بنائے بتیاں

کہ تابِ ہجراں نہ دارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

حافظ محمود شیرانی نے پنجاب میں اردو میں بھی ان کے اس طرز کے ریختہ کا نمونہ درج کیا ہے[3]

تیلی پسرے کہ می فروشد تیلے ۔۔۔ از دست و زبان چرب او واویلے

خالے بہ لبش دیدم و گفتم کہ تل است ۔۔۔ گفتا کہ بروں نیست دریں تل تیلے

امیر خسروؒ کے ریختہ میں جہاں ایک مصرع فارسی اور ایک ہندی یا نصف مصرع فارسی اور

---

[1] ؛ مخزن نکات، ص ۲ ۔ نکات الشعراء، ص ۲

[2] ؛ آب حیات، ص ۷۷

[3] ؛ پنجاب میں اردو، ص ۱۲۵

نصف ہندی کا ملتا ہے، ایسا ریختہ بھی نظر آتا ہے جس میں صرف ایک دو ہندی الفاظ
پورے فارسی بند کے آخری مصرع میں موجود ہیں مثلاً

رفتم بہ تماشا بہ کنارے جوئے
دیدم بہ لبِ آب زنِ ہندوئے
گفتم صنما چیست بہائے مویت
فریاد بر آورد کہ "دُر دُر موئے"

یعنی تجھے موت آئے دُر دُر — دُر دُر کے الفاظ ہندی گفتگو میں کسی
کو دور بھگانے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ صنعت ایہام سے شاعر
نے عجیب معنی پیدا کیے ہیں۔ دُر کے معنی فارسی میں موتی اور مُو کے
معنی بال کے ہیں۔ اس سے یہ مراد بھی ہے کہ ایک ایک بال کی قیمت
ایک ایک موتی ہے۔

ایک گوجری کے متعلق جو دہی بیچ رہی تھی امیر خسروؒ نے کہا ہے۔

گجری تو کہ در حسن و لطافت چو مہی
آں دیگِ دہی بر سرِ تو چترِ شہی
از ہر دو لبت قند و شکر می ریزد
ہر گاہ بگوئی کہ دہی لیو دہی

اس بند میں بھی آخری ایک دو لفظ ہندی کے ہیں۔ مؤلف فرہنگ آصفیہ نے
حضرت امیر خسرو کے ایک شہر آشوب کا ذکر بھی کیا ہے جس کے دو شعر یہ ہیں۔

ہندو بچہ بیں کہ عجب حسن دھرے چھے
بر وقت سخن گفتن مکھ پھول جھرے چھے
گفتم ز لب لعل تو یک بوسہ بگیرم
گفتا کہ ارے رام ترک کائیں کرے چھے

یہ شہر آشوب مکمل شکل میں مولانا محمد امین چڑیا کوٹی کی تالیف جواہر خسرویؒ میں

موجود ہے اور اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ اس کے آخری مصرع میں چند الفاظ ہندی کے ہیں اور ردیف بھی اسی قسم کی ہے۔

ریختہ کے علاوہ امیر خسروؒ کے اپنے زمانے کی بھاشا میں جسے امیر خسروؒ نے دیباچہ غرّۃ الکمال میں ہندی (ہندوی) کہا ہے شعر موجود ہیں۔ یہ مختلف اصناف اور شکلوں میں ہیں۔ وہ خود دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ میں نے نظم ہندی کے چند جز بھی دوستوں کی نذر کیے ہیں۔ اس قسم کی ابیات کا نمونہ دیکھئے۔

وہ گئے بالم وہ گئے ندیلو کنار
آپے پار اُتر گئے ہم تو رہے اروار
بھائی رے ملاح تو ہم کوں پار اتار
ہاتھ کا دیوں گی مندرا گل کا دیوں ہار

خالق باری امیر خسروؒ سے منسوب ایک ایسی تصنیف ہے جس میں ہندی شاعری کی کئی صورتیں ہیں لیکن حافظ محمود شیرانی مرحوم کہتے ہیں[1] کہ یہ امیر خسروؒ کی تصنیف نہیں ہے بلکہ الحاقی ہے۔ اسی طرح ان کی بیسیوں پہیلیاں، کہہ مکرنیاں وغیرہ بھی ان سے نسبت کے لحاظ سے مشکوک ہو جاتی ہیں۔ واللہ اعلم۔ مولوی عبدالحق مرحوم نے اپنی تالیف اُردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام میں لکھا ہے کہ "ان کی صحت کا اس وقت کوئی ذریعہ نہیں"۔ لیکن اگر انصاف سے دیکھا جائے تو ان کی عدم صحت کا بھی کوئی ذریعہ نہیں محض ایک نئی بات کرنے کے لیے بات کرنا بھی تو مناسب نہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات میں امیر خسروؒ کی کئی انمیلیاں، کہہ مکرنیاں، پہیلیاں، اور ڈھکوسلے وغیرہ دیے ہیں اور خالق باری کا نمونہ بھی انہی کے نام سے دیا ہے۔ یہ نمونے اپنے مزاج اور انداز کے اعتبار سے ان نمونوں سے ملتے ہیں جو اس سے پہلے امیر خسروؒ کی ہندی (بھاشا) شاعری کے سلسلے میں دیے گئے ہیں اس لیے ان کی امیر خسروؒ

---

[1] پنجاب میں اُردو (مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی)، ص ۱۸۰ تا ۲۰۱

سے نسبت پر شک کرنا مناسب نہیں۔ اگر شک کرنا ہے تو پھر پہلے نمونوں پر بھی کرنا ہو گا اور پھر جب شاعر کا تخلص شعروں میں موجود ہو تو ان کی متعلقہ شاعر سے نسبت کو تسلیم کرنے میں کون سی قباحت ہے۔ یا تو کوئی اور خسرو پیدا کریں کہ یہ اس کے شعر ہیں جو اصل امیر خسرو سے منسوب کر دیے گئے ہیں، لیکن یہ دریافت بھی ناممکن ہے۔ ذیل میں نمونہ کلام دیکھئے[1] :

پہیلی : بالا تھا جب سب کو بھایا
بڑا ہوا کچھ کام نہ آیا
خسرو کہہ دیا اس کا ناؤں
بوجھو نہیں تو چھوڑو گاؤں

اس پہیلی کا جواب ہے چراغ (دیا)

انمل : کھیر پکائی جتن سے چرخہ دیا جلا
آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا
لا پانی پلا

ڈھکوسلا : بھادوں کی پکی پیپلی جوں جوں بڑی کپاس
بی مہترانی دال پکاؤ گی یا ننگا ہی سو رہوں

دو سخنے (فارسی اردو)

سوداگر را چہ می باید + بوچے کو کیا چاہیئے ۔ دوکان
تشنہ را چہ باید + ملاپ کو کیا چاہیئے ۔ چاہ
شکار بہ چہ باید کرد + قوت مغز کو کیا چاہیئے ۔ بادام

کان سے مراد سودا سلف بیچنے کی جگہ اور دوکان یعنی سننے والے دو کان (جسمانی عضو) چاہ سے مراد کنواں اور چاہ سے مراد محبت۔ (لگاؤ) بادام سے مراد ایک پھل جس کا مغز قوت دماغ کے لیے مفید ہے اور بادام سے مراد جال کے ساتھ (با کے معنی ساتھ اور

---

[1] : آب حیات، ص ۸۷

اور دام کے معنی جال)۔

مکرنی[1] : وہ آوے تب شادی ہوئے
اس بن دوجا اور نہ کوئے
میٹھے لاگے وا کے بول
اے سکھی ساجن نا سکھی ڈھول

دوہے[2] : گوری سوئے سیج پر مکھ پر ڈالے کیس[3]
چل خسرو گھر اپنے رین بھئی چھوں دیس

چکوا چکوی دو جنے ان مت مارے کوئے
یہ مارے کرتار کے رین بچھویا ہوئے

ان اصناف سخن کے علاوہ امیر خسروؒ کا کچھ ایسا کلام بھی ہے جس کی عجیب اور نامانوس سی شکلیں ہیں ۔ یہ ان کی خاص جودت ذہن اور روانی طبع کا کرشمہ معلوم ہوتا ہے ۔ ان میں کچھ تو گیت ہیں جو عورتوں اور لڑکیوں کے گانے کے لیے ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بہار ہند یعنی موسم برسات میں جھولا جھولنے کے وقت گانے کے لیے لکھے گئے ہیں۔ مثلاً ایک چھوٹی لڑکی کہتی ہے[3]

اماں میرے باوا کو بھیجو جی ــــــ کہ ساون آیا

ماں جواب دیتی ہے

بیٹی تیرا باوا تو بڈھا ری ــــــ کہ ساون آیا

بیٹی کہتی ہے

اماں میرے ماموں کو بھیجو جی ــــــ کہ ساون آیا

---

[1] ، آب حیات ، ص ۷۴ ۔ [2] ، ہندی کے مسلمان شاعر از سید امیر حسن نورانی ص ۲۶ / ۲۷
[3] ، آب حیات ، ص ۷۳ / ۷۴ / ۷۵

ماں جواب دیتی ہے

بیٹی تیرا ماموں تو بانکا ری ـــــــ کہ ساون آیا

ایک رات کسی مجلس میں امیر خسروؒ کے مرشد حضرت سلطان جی نظام الدین اولیاءؒ نے جو مجلس سے جانا چاہتے تھے گھڑیال کی آواز سن کر امیر خسروؒ سے پوچھا "خسرو یہ کیا بجا" عرض کی آدھی رات کی نوبت ہے۔ پوچھا اس میں کیا آواز آتی ہے۔ امیر خسروؒ کہنے لگے کہ سمجھ میں تو ایسا آتا ہے کہ کہہ رہی ہے[1]

نان کہ خوردی خانہ برو خانہ برو خانہ برو

نان کہ خوردی خانہ برو نہ کہ بدست تو کردم خانہ گرو

خانہ برو خانہ برو

ایک دفعہ دُھنئے کے روئی دھننے کی آواز کو امیر خسروؒ نے لفظوں میں یوں بند کر دیا تھا[2]

در پئے جاناں جاں ہم رفت۔ جاں ہم رفت جاں ہم رفت۔ آں ہم رفت رفت رفت۔ جاں ہم رفت۔ ایں ہم رفت و آں ہم رفت۔ آں ہم رفت آں ہم رفت۔ ایں ہم رفت آں ہم رفت اینہم۔ آنہم رفت۔

روئی دھنتے وقت آواز میں جو زیر و بم پیدا ہوتا ہے۔ یہ الفاظ بالکل اس سے ہم آہنگ ہیں۔

مذکورہ بالا جملہ شعری نمونوں سے ہمیں شاعری کے میدان میں امیر خسروؒ کی قوت اختراع کا اندازہ ہو جاتا ہے اور یہ پتہ چل جاتا ہے کہ اس دور میں اردو زبان و ادب کی ابتدائی شکلوں نے کیا کیا رُخ اختیار کیا تھا اور امیر خسرو کی وجہ سے اس میں کیا کیا اختراعات ہوئی تھیں اور ان کی کتنی تشہیر ہو چکی تھی۔

---

[1] آب حیات از محمد حسین آزاد، ص ۷۵

[2] آب حیات از محمد حسین آزاد، ص ۷۵

شاہ بہرام فرید ثانی رحمۃ اللہ علیہ

خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ کی گیارہویں بارہویں پشت میں شاہ بہرام چشتیؒ کے نام سے ایک بزرگ ہوئے ہیں جو فرید ثانی کے لقب سے مشہور تھے ان کا دور سکھ مذہب کے بانی باباگورونانک کا دور تھا۔ بابا نانک ایک دفعہ ان سے ملنے اجودھن آئے۔ ان دونوں کی جنگل میں اس مقام پر ملاقات ہوئی جسے مسلمان آج فتح اللہ نوری شاہ اور سکھ ہندو نانک سر کہتے ہیں۔ دوران ملاقات گورونانک فریدثانی کو کہنے لگے[1]

پڑھتے پڑھتے دند گھسے کسے نہ کیتی ہو

اس پر شاہ بہرام نے جواب دیا:

ایکو حرف پریم کا پڑھے سو پنڈت ہو
متھے تیوڑی دور کر پتّا سٹیں دھو

پھر گورونانک نے کہا:

صاحب دیاں دو حداں + کس نوں پکڑاں کس نوں چھڈاں

شاہ بہرامؒ نے جواب دیا:

صاحب کی دو حد + سچ نوں پھڑ کوڑ نوں چھڈ

تیسرا بول گورونانک نے یہ بولا:

کلمہ کہاں تاں گل پوے بن کلماں بھی ناں
ہندو کہاں تاں ماریا مسلمان بھی ناں

اس پر فریدثانیؒ فرمانے لگے:

دوہاں تے پانی وار پی جے پایو بھگوان
ایکو برہم پچھان کے دنیا ناسی جان

---

[1] تفصیل کتاب "اشلوک فریدی" از پنڈت جیتی رام شوق میں دیکھئے۔

اس مکالمے کے بعد گورونانک نے فریدؒ ثانی سے کہا کہ انہیں اجازت دیں کہ وہ باوا فرید گنج شکرؒ کے دوہے، شبد اور اشلوک اپنے گرنتھ میں شامل کرلیں کہا جاتا ہے کہ فریدؒ ثانی نے فرید اوّل کی روح مبارک سے اجازت لے دی اور اس طرح بابا گورونانک نے وہ تمام اشلوک اور شبد اپنی مذہبی کتاب گرنتھ میں شامل کرلیے جو باوا فرید گنج شکرؒ کے کہے جاتے ہیں۔

اس واقعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ چشتیہ بزرگوں کا اثر کلام و افکار کی صورت میں کہاں تک پہنچا ہے۔ گورونانک ایک فرد نہیں تھے، ایک مذہب کے بانی تھے۔ وہ لودھیوں کے زمانے میں تلونڈی (ننکانہ پنجاب) میں ۱۴۶۹ء میں پیدا ہوئے۔ باپ ایک متوسط محنت کش تھا۔ بیٹا بچپن سے ہی دنیا سے نفور اور خدا کی طرف راغب تھا۔ اسلام کی عام تبلیغ اور توحید کی اثر اندازی نے برصغیر میں جس بھگتی تحریک اور بھگتوں کو جنم دیا تھا، گورونانک اسی زنجیر کی ایک کڑی ہیں۔ دیوی دیوتاؤں سے بیزاری اور ذات پات سے نفرت دوسری بھگتی تحریکوں کی طرح ان کے مذہب کی بنیاد بھی تھی۔ اس طرح وہ توحید کے قریب ہونے کی وجہ سے اسلامی عقائد اور مسلمان صوفیا سے بہت متاثر تھے۔ ان کے بعض خیالات سے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ مسلمان ہی تھے لیکن بعد کے گوروؤں نے سکھ مذہب کو ہندو مذہب اور ثقافت میں مدغم کرکے اس شناخت کو ختم کر دیا جو گورونانک کے سکھ مذہب کی روح تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوؤں نے ان کو بڑی چالاکی سے نہ صرف ہراول دستے کے طور پر ہمیشہ مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا بلکہ ان کو سیاسی، ثقافتی، تہذیبی، اقتصادی اور مذہبی اعتبار سے ابھرنے بھی نہیں دیا اور انہیں ظاہری شکل و صورت کے اعتبار سے بھی گورونانک سے دور کر دیا۔ اگر سکھ اپنے گورو کی شکل و صورت پر رہتے تو وہ ظاہری طور پر بھی مسلمان درویشوں کے قریب رہتے اور باطنی طور پر بھی اور اگر گورونانک کے بعد جتنے بھی گورو ہوئے ہیں وہ ہندوؤں کی بجائے گورونانکی ہوتے تو سکھ ہندو مذہب میں مدغم ہونے سے بھی بچ جاتے۔ گورونانک ان پڑھ تھے۔ پھر بھی انھوں نے بھگتوں کے بہت سے بھجن جمع کیے۔

لہ : حاشیہ اگلے صفحہ پر دیکھیں۔

اور گرنتھ کے نام سے ایک مذہبی کتاب مرتب کی۔ بھگتوں کے علاوہ اس میں سکھوں کے دوسرے گوروؤں کا کلام بھی ہے جو دراصل گورونانک نہیں ہندو تھے۔ اس میں گورو انگد، گورو امرداس، گورو رام داس، گورو ارجن، گورو تیغ بہادر کا کلام اور دسویں گورو گوبند سنگھ کا ایک شعر بھی ہے [۱] گوروؤں کی تصانیف اور بھی ہیں جو مدحیہ نظموں پر مشتمل ہیں یہ نظمیں موسیقی کی اکتیس راگنیوں کے مطابق لکھی گئی ہیں۔ اس فرقے کے ہر گورو نے سوائے گورو گوبند سنگھ کے اپنا تخلص نانک رکھا ہے۔

سکھوں کا گرنتھ اور دوسری تصانیف اسی پنجابی میں ہیں جس پر برج بھاشا اور کھڑی بولی کے اثرات ہیں۔ ان کا رسم الخط گورمکھی ہے لیکن اگر ان کو عربی رسم الخط میں لکھا جائے تو یہ قدیم اُردو کے قریب پہنچ سکتی ہیں۔ ان کتابوں کا بنیادی موضوع خدا کی توحید، صلح کل، خدمت خلق وغیرہ ہے۔ زبان سادہ اور صاف ہے۔ اس وجہ سے یہ عوام میں بھی مقبول ہیں۔ مذہبی اعتبار سے کبیرداس اور نانک ایک دوسرے کے بہت قریب معلوم ہوتے ہیں۔ نانک کا کلام اس طرز کا ہے [۲]

سانس ماس سب جیو تمہارا + تو ہے کھرا پیارا
نانک شاعر یوں کہت ہے + سچے پروردگارا

چونکہ سکھوں کے ہر شاعر گورو نے نانک ہی تخلص کیا ہے اس لیے ایک شاعر کے کلام کا دوسرے شاعر کے کلام سے منسوب ہو جانا کچھ بعید نہیں۔

شیخ لطیف الدین دریانوش رحمۃ اللہ علیہ

حضرت دریا نوشؒ ساتویں صدی ہجری کے مشہور چشتیہ بزرگ تھے۔ جو حضرت نظام الدین اولیاء کے مرید تھے۔ ایک روز جب انہوں نے یہ خبر سُنی کہ شیخ اپنے خلفاء

---

[۱] سابقہ صفحہ کا حاشیہ دیکھیں؛ ہندی شاعری میں روحانیت کا دور از گوری سری لال ورستو ایم اے رسالہ اُردو، اپریل ۱۹۴۲ء، ص ۲۴۲ [۲] داستان تاریخ اُردو از حامد حسن قادری ص ۲۱۔

اور مریدوں پر بہت مہربان ہیں اور فیضان روحانی سے نواز رہے ہیں۔ تو وہ بھی اپنی والدہ کی اجازت سے شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے والدہ نے اجازت کے ساتھ اپنا دوپٹہ بھی دیا جسے انہوں نے اپنے سر پر باندھ لیا۔ جب یہ اپنے حضرت کی خدمت میں پہنچے تو اس وقت وہ وضو کر رہے تھے۔ شیخ نے کہا لطیف الدین تم مناسب وقت پر آگئے مجھے پہلے ہی تمہارا انتظار تھا جو مانگنا ہے مانگو۔ حضرت دریا نوشؒ نے عرض کی "کنجے و فقیری" یعنی گوشہ نشینی اور فقیری۔ یہ سن کر حضرت نظام الدین اولیاؒ بہت خوش ہوئے۔ وضو کا پانی عنایت فرمایا اور دونوں کان پکڑ کر کہا لطیف الدین دریا نوشؒ تو نے کیا عمل کیا تھا جو یہ توفیق پائی۔ شیخ دریا نوشؒ نے والدہ سے اجازت مانگنے، ان کا دوپٹہ دینے، دوپٹے کو سر پر باندھ کر آنے کے واقعہ کا ذکر کیا۔ حضرت نظام الدین اولیاء کہنے لگے کہ وہ دوپٹہ لاؤ۔ جب شیخ دریا نوشؒ نے دوپٹہ اتار کر اپنے پیر و مرشد کے حوالے کیا تو وہ کہنے لگے رحلت کے وقت یہ دوپٹہ میرے کفن میں رکھ دینا۔

شیخ دریا نوشؒ زندگی میں ایسے ہی فقیر رہے جس کی ان کو تمنا تھی۔ شہر سے پرانی سرکیاں اکٹھی کر کے جھونپڑی بنا لیتے اور اس میں رہتے اگر کوئی انہیں یہ کہتا کہ آپ باقاعدہ گھر کیوں نہیں بنا لیتے تو وہ جواب دیتے[1]

آرے آرے بابا ہمے بنجارے
کیا گھر کرتے ہیں بنجارے

اس سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ دریا نوش اپنی عام گفتگو میں ہندوی زبان استعمال کرتے تھے۔ سچ کہا ہے اقبال نے

درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر اس کا نہ دلی نہ بخارا نہ سمرقند

---

[1] اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۱۸ / ۱۹

شیخ سراج الدین عثمان رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۷۵۸ھ)

شیخ سراج الدین عثمانؒ، جو اخی سراج کے لقب سے مشہور ہیں، حضرت نظام الدین اولیاء کے جلیل القدر خلیفہ تھے[1]۔ علوم ظاہری مولانا فخر الدین رازی اور مولانا رکن الدین سے حاصل کیے اور علوم باطنی سلطان المشائخ سے۔ ان کے مرشد سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی نے آپ کو آئینہ ہند کے خطاب سے نوازا تھا[2]۔

شیخ اخی سراج اپنے مرشد کی وفات کے تین سال بعد تک دہلی میں رہے اور پھر تبلیغ دین اور اشاعت عرفان کے لیے بنگال تشریف لے گئے۔ سید مبارک میر خوردؒ نے سیر الاولیاء میں ان کی بنگال میں تبلیغی سرگرمیوں کا ذکر کیا ہے۔ ان کا مزار بنگال کے ایک قصبہ سعد اللہ پور میں ہے[3]۔

اپنے پیر و مرشد سلطان المشائخ کی وفات کے بعد جب شیخ اخی سراجؒ نے خواجہ نصیر الدین چراغ دہلویؒ سے خرقۂ خلافت حاصل کیا تو انھوں نے آپ کو بنگال جانے کے لیے کہا تھا۔ تاریخ فرشتہ کے مؤلف نے لکھا ہے[4] کہ اس موقع پر اخی سراجؒ نے عرض کی کہ وہاں تو شیخ علاؤ الدین قلؒ پہلے ہی موجود ہیں اور مخلوق خدا پہلے ہی ان کی طرف رجحان رکھتی ہے، میرا وہاں جانا بے سود ہوگا۔ اس پر خواجہ نے فرمایا "تم اوپر وے تلے" یعنی تم اوپر ہوگے اور وہ تم سے نیچے۔ یہ بات سن کر شیخ اخی سراجؒ بہت خوش ہوئے اور بنگال چلے گئے اس گفتگو سے اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ جہاں خواجہ نصیر الدین چراغ دہلویؒ ہندی میں کلام کر سکتے تھے، شیخ اخی سراجؒ سمجھ بھی سکتے تھے اور اس سے یہ نکتہ بھی نکلتا ہے کہ انھوں نے بنگال جا کر اس زبان میں جو عام فہم ہوگی ضرور تبلیغی گفتگو کی ہوگی

---

[1]: اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار از شیخ عبدالحق محدث دہلوی (اردو ترجمہ)، ص ۱۶۲

[2]: اردوئے قدیم از شمس اللہ قادری ۲۱ — روضۃ الاقطاب از رونق علی ص، ۴۸ / ۴۹

[3]: تذکرہ صوفیائے بنگال از اعجاز الحق قدسی ص ۱۹۳ تا ۲۱۸

[4]: تاریخ فرشتہ جلد دوئم (فارسی) از حکیم محمد قاسم فرشتہ ص ۳۹۹

اور اس طرح وہ دِلّی کی زبان کے اثرات کو بنگال تک لے جانے کا سبب بھی بنے ہوں گے۔
ویسے بھی جدید تحقیق کے مطابق علمائے لسانیات نے بنگالی زبان کو اودھ مگدھی یہ پراکرت کی شاخ یا اس سے پیدا شدہ زبان کہا ہے[1]۔ ایک گروہ بنگالی کی اصل کو دراوڑی بھی کہتا ہے۔ بابو بجے چند نے اپنی کتاب تاریخ زبان بنگالی میں یہی رائے دی ہے۔ البتہ یہ بات غلط ہے کہ اس کی اصل سنسکرت ہے۔ ہاں سنسکرت الفاظ کے اس میں عمل دخل سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ جس طرح جنوبی ہند میں دراوڑی، بہار میں مگدھی اور پنجاب میں پنجابی کے اثرات قدیم اُردو (ہندوی) پر ہیں۔ اس طرح ہندی اور بنگالی نے بھی ایک دوسرے پر اثرات مرتب کیے ہیں۔ اس لیے ہم بنگالی کی ایسی تحریروں اور جملوں کو بھی ضرور اُردو کی ابتدائی شکل کہیں گے جو ہمیں ہندوی اثرات لیے ہوئے نظر آتے ہیں۔

بنگالی زبان کی طرف مسلمانوں کی خصوصی توجہ کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ اس میں صوفیائے چشت کی تبلیغ سے پہلے جو ادب موجود تھا وہ زیادہ تر وشنومت کے اثرات لیے ہوئے تھا جس کو ہندو فلسفی درویش چیتانیہ نے بنگال میں عام کیا تھا۔ اس ادب میں موجود وشنو خیالات سے مسلمان بھی اثر پذیر ہو رہے تھے۔ چیتانیہ کا ایک قریبی ساتھی ہری داس نام کا تھا۔ وہ اصل میں مسلمان تھا اور قاضیوں کے خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے بھی وشنومت کا پرچار کر رکھا تھا۔ اس طرح ایک پٹھان بجلی خان نے بھی وشنومت اختیار کر لیا تھا[2]۔ اس قسم کی تبدیلی کی وجوہات میں ایک وجہ بنگالی زبان و ادب کا وشنومت کے تحت ہونا اور اسے پڑھ کر مسلمانوں کا اثر پذیر ہونا بھی ہے۔ راماین، مہابھارت، گیتا اور دوسری مذہبی کتابیں جو بنگالی زبان میں تھیں مسلمان اور نومسلم بھی انہی کو پڑھتے تھے۔ مسلمانوں کو اس اثر سے نکالنے کے لیے ہمارے بزرگوں نے بھی بنگالی ادب پیدا کیا۔ سید سلطان نے بنگالی زبان میں ایک کتاب وفات رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نام سے لکھی ہے جس میں انہوں نے کہا کہ بنگالی

---

[1] : مضمون بنگالی زبان و ادب کا نشوونما از دنیش چندر سین، رسالہ ملخص الاردو ص ۱۲۸۔
[2] : رود کوثر از شیخ محمد اکرام، ص ۴۴۸۔
[3] : رود کوثر، ص ۴۷۱۔

مسلمان عربی فارسی نہیں جانتے اور بنگال میں اسلامی موضوعات پر کتابیں نہیں ہیں، وہ رامائن اور مہابھارت پڑھتے ہیں، میں اس صورتِ حال کی اصلاح کے لیے اپنی کتابیں بنگالی زبان میں لکھ رہا ہوں، علما اسے ناپسند کرتے ہیں اور مجھے منافق کہتے ہیں لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ میرا فرض ہے۔ سید سلطان نے شب معراج، رسُول وجے، وفات رسُول، ابلیس نامہ، معرفتی کان، گیان پردیپ وغیرہ کے نام سے بنگالی زبان میں مختلف مذہبی موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں اور اس طرح مسلمانوں اور نومسلموں کو ان کے اپنے دینی رجحانات اور مذہبی عقائد کا تحریری و ادبی ماحول عطا کیا ہے۔ سید سلطان کے اس اجتہادی اور جرأت مندانہ اقدام نے ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی اور اس طرح بنگالی زبان میں مسلمانی ادب کا بہت بڑا ذخیرہ پیدا ہو گیا جس کے نتیجے میں بنگال کے مسلمان ہندو اور وشنو اثرات سے آزاد ہو گئے۔

شیخ علاء الدین علاء الحق بنگالی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۸۰۰ھ)

بنگال میں چشتیہ نظامیہ سلسلے کی بنیاد شیخ سراج الدین اخی سراج نے رکھی[1] اور ان کے مرید اور خلیفہ شیخ علاء الدین علاء الحقؒ نے اس پر مزید عمارت تعمیر کی۔ مؤلف منہاج الولایت نے انہیں صحیح النسب ہاشمی لکھا ہے۔ وہ لاہور (پنجاب) کے رہنے والے تھے۔ بڑے امیر خاندان اور ارکان سلطنت میں سے تھے اور اپنے لیے گنج نبات کا لقب اختیار کر رکھا تھا۔[2] صاحب خزینۃ الاصفیا نے کہا ہے[3] کہ خواجہ فریدالدینؒ کے لقب گنج شکر کی بنا پر یہ بات خواجہ نظام الدین اولیاء کو پسند نہ تھی کہ حضرت علاء الحقؒ کا لقب گنج نبات ہو۔ ان کی ناپسندیدگی ایک کرامت کے طور پر ظہور میں آئی اور وہ یہ کہ علاء الدین علاء الحقؒ کی زبان بند ہو گئی لیکن جب وہ شیخ اخی سراجؒ کے مرید ہوئے تو ان کی زبان کھل گئی اور اس لقب سے بھی دستبردار ہو گئے۔ مرید ہونے کے بعد شیخ علاء الحقؒ نے بہت زیادہ عبادت و ریاضت کی۔ امارت کو فقر میں بدل دیا۔ سخاوت بھی بہت کی اور اس طرح ان کی شہرت دور دراز تک ہو گئی۔ اپنے

---

[1] اخبار الاخیار (فارسی) از شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۴۳ [2] تذکرہ صوفیائے بنگال از اعجاز الحق قدوسی ص ۲۶۵، ۲۷۵
[3] موج کوثر از شیخ محمد اکرام، ص ۳۴۵

مرشد کے دائرہ تبلیغ و تلقین کو اور وسیع کیا اور لوگوں کو خصوصاً اہل بنگال کو عرفان و معرفت اور رشد و ہدایت کے سرچشموں سے آب حیات پلایا۔ چونکہ انہوں نے بنگال کے ایک قصبہ پنڈوہ کو اپنی تبلیغ کا مرکز بنایا تھا اس لیے آپ پنڈوی بھی کہلاتے ہیں۔ ان کا مزار بھی یہیں ہے[۱]

بنگالی کو اسلامی رنگ دینے میں مسلمان ادیبوں خصوصاً صوفیا نے بڑا کام کیا ہے بنگال کی سیاست، مذہب اور ثقافت پر جب تک ہندوؤں کا کامل اثر و رسوخ رہا اس پر دیوی دیوتاؤں کے نقوش ثبت رہے جب مسلمانوں نے اس طرف توجہ کی تو انہوں نے دیوی دیوتاؤں کی بجائے خدائے واحد کو اپنے خیالات کا مرکز بنایا اور اس طرح بنگالی میں وسیع پیمانے پر ایسا ادب پیدا کرلیا جو خالصتاً توحیدی اور عرفانی رنگ لیے ہوئے تھا۔ یہ ادب اس کثرت اور اس انداز سے پیدا ہوا کہ اس کی الگ شناخت قائم ہوگئی اور یہ پوتھی ادب کہلانے لگا۔ اس ادب کا میدان بڑا وسیع تھا، تاریخ، سیر، مذہب، تصوف، اخلاق، شعر سب اس میں شامل تھے۔ بعض صوفیاء نے دیوناگری کی بجائے عربی رسم الخط بھی اختیار کیا ہے اور اپنی تحریروں کو عربی بنگالی میں لکھا ہے۔ اس طرز فکر نے بنگالی اور ہندی (قدیم اردو) کے فاصلوں کو بہت کم کیا ہے لیکن افسوس ہے یہ رجحان بنگالی مسلمانوں میں بعد میں قائم نہ رہ سکا جس کے نتیجے میں بنگالی زبان اُردو سے بالکل الگ تھلگ نظر آنے لگی بلکہ عہد حاضر میں حریف اور عدو کے طور پر سامنے آگئی۔ اگر پنجابی، پشتو، بلوچی، براہوی، سندھی، ہندکی، وغیرہ کی طرح بنگالی بھی عربی رسم الخط ہی میں لکھی جاتی رہتی تو یہ لسانی عداوت اور بُعد اس شدّ و مد سے سامنے نہ آتا۔ ہمارے جملہ صوفیائے بنگال نے جن میں شیخ علاؤ الدین علاؤ الحق اور ان کے سلسلے کے دوسرے بزرگ بھی شامل ہیں، بنگالی پوتھی ادب کی بنیاد رکھنے میں اس صورت میں ضرور حصہ لیا ہے کہ انھوں نے اپنی تبلیغی سرگرمیوں سے بنگالی زبان میں عربی و فارسی الفاظ کی آمیزش کی ہے اور اس طرح ایک نئی زبان کی صورت پیدا کرنے میں ضرور مدد دی ہے ایسی زبان جو اسلامی چھاپ کی حامل ہونے کے ساتھ ساتھ اُردوئے قدیم کی ترویج کا سبب بھی بنی ہے۔ ابلیس نامہ، نور تندیل، شریعت نامہ، نشاط نامہ قسم کی تصانیف اسی کوشش کے نتیجے میں معرض وجود

---

[۱] بزم صوفیا از صباح الدین عبد الرحمٰن، ص ۴۴۳

میں آئی ہیں۔ پوتھی ادب کی دوسری تصانیف کی طرح یہ بھی نظم میں ہیں[1]۔

حضرت نور قطب عالم شیخ نور الحق پنڈوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۸۱۸ھ)

شیخ نور الحقؒ جو نور قطب عالم کے نام سے مشہور ہیں۔ شیخ علاؤ الحقؒ کے بڑے فرزند تھے[2]۔ ریاض السلاطین میں لکھا ہے کہ وہ سلطان غیاث الدین اعظم شاہ کے ہم جماعت تھے ان کے والد اگرچہ درویش تھے لیکن ان کی خاندانی امارت و ثروت مسلمہ ہے۔ ان کے سلطانی اور فقیری دونوں زمانوں کی سخاوت کے قصے زبان زد خلائق تھے۔

حضرت نور قطب عالمؒ نے شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے خلیفہ حمید الدین ناگوریؒ سے تعلیم حاصل کی لیکن بیعت اپنے والد کے ہاتھ پر ہوئے جو چشتیہ مسلک رکھتے تھے۔ حمید الدین ناگوریؒ ہندی زبان جانتے اور بولتے تھے۔ اس کی شہادت ان کے بعض ملفوظات سے ملتی ہے۔ ناطق نے اپنی کتاب نظم اُردو میں[3] ان کا یہ ہندی قول نقل کیا ہے۔ " پیو نہ پلو پچھے پا تری مجھ سہاگن ناؤں "

مذکورہ بالا قول بظاہر تو چند الفاظ پر مشتمل ہے لیکن یہ ایک پوری تحریک کی نشان دہی کرتا ہے۔ وہی زبان جس نے ہر علاقے میں ابتدائی اُردو کی شکل اختیار کی ہے اور بنگال میں بھی وہ ادب معرض وجود میں آیا ہے جن کو مسلمان صوفیاء نے بنگالی بھاشا کی ہندوانہ گرفت سے آزاد کرکے مسلمانی پوتھی ادب کی شکل دی ہے"۔ بنگالی ادب کی تاریخ" کے نام سے ڈاکٹر شہید اللہ، محمد عبدالحیؒ، سید علی احسن وغیرہ نے جو مقالے تحریر کیے ہیں وہ اس تبدیلی پر شاہد ہیں۔ حضرت نور قطب عالمؒ نے بھی اپنی تبلیغی و تلقینی سرگرمیوں

---

[1] بنگال کا پوتھی ادب از ابو المکارم سلیم اللہ فہمی (دیباچہ حفیظ ہوشیارپوری) ص ۴۔

[2] اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار (فارسی) از شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۵۲

[3] نظم اُردو از ابو العلا ناطق، ص ۹۶ تا ۱۰۰

کے ذریعے اس ادب کی بنیاد رکھنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کے استاد حمید الدین ناگوریؒ ہندی جانتے تھے ہندی بولتے تھے۔ اس لیے حضرت نور قطب عالمؒ کا اس زبان سے واقف ہونا بعید از قیاس نہیں بنگالی زبان پر ان کی اس ہندی شناسی نے لازماً گہرا اثر ڈالا ہے۔

شیخ انوار الحق پنڈوی رحمۃ اللہ علیہ

شیخ انوار الحقؒ حضرت نور قطب عالمؒ کے چھوٹے فرزند اور حضرت علاء الحق لاہوری بنگالیؒ کے پوتے تھے۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے ان کا خاندان امارت و ثروت کے اعتبار سے بڑا اونچا درجہ رکھتا تھا۔ خود شیخ علاء الحق پنڈویؒ اکابر اغنیاء میں شمار ہوتے تھے لیکن خدا تلاشی کی لگن ایسی لگی کہ شیخ سراج الدین عثمان المعروف بہ اخی سراجؒ کے مرید ہو کر ان کی خلافت سے سرفراز ہوئے اور بنگال میں پنڈوہ (ضلع مالدہ) کو مرکز بنایا جہاں سے اکابر اولیاء اور علماء فیض یاب ہو کر نکلے۔ شیخ علاء الحقؒ بڑے شاہ خرچ تھے۔ شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ کہتے ہیں[1] کہ ان کے بے شمار خرچ کو دیکھ کر بادشاہ کو بھی رشک آتا تھا۔ بہت ہی مخیر اور سخی تھے۔ ان کی یہ صفت ان کی اولاد خصوصاً شیخ انوار الحقؒ پنڈوی میں بھی بدرجہ اتم موجود تھی۔ فقیروں اور مسکینوں پر ہمہ وقت خرچ کرتے رہتے تھے اور ان کے لیے لذیذ اور قیمتی کھانوں کا دستر خوان ہر وقت بچھا رہتا تھا۔ اپنے والد شیخ نور قطب عالمؒ کی طرح بڑے صاحب عشق و محبت اور عالم ولی تھے۔

پنڈوہ دراصل ایک موضع نہیں تھا بلکہ ایک تحریک تھی جہاں سے اسلامی علوم و فنون اور رشد و ہدایت کے سرچشمے پھوٹ کر پورے بنگال بلکہ بہار تک کو سیراب کر رہے تھے جب بنگال کے راجہ گنیش نے مسلمانوں پر بہت ظلم شروع کیا تو یہ شیخ

---

[1] اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار (ذکر انوار الحق)

نور قطب عالمؒ ہی تھے جنھوں نے سلطان ابراہیم شرقی کو بنگال پر حملہ کی دعوت دی تھی۔ سلطان کی فوج کشی سے راجا ایسا ہراساں ہوا کہ بھاگ کر پنڈوہ کی خانقاہ میں آگیا۔ شیخ سے جان بخشی چاہی اور اپنے بیٹے جادلو کو مشرف بہ اسلام کرا کے جلال الدین کے نام سے تخت پر بٹھادیا۔ یہ ایک تنہا واقعہ نہیں ایک تحریک کی کڑی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے کے درویشوں کی خانقاہیں اور مدرسے کس اہمیت کے حامل تھے اور ان مراکز سے ملک کے علمی، دینی، سماجی اور سیاسی اداروں اور معاملات پر کس حد تک نگاہ رکھی جاتی تھی۔ اسی بناء پر اور اسی ضرورت کے تحت ان صوفیاء کو مقامی لوگوں کے مذہب، حالات اور زبان و ادب سے آشنائی پیدا کرنا پڑتی تھی اور جہاں موقع کا تقاضا ہوتا تھا مقامی زبان میں گفتگو بھی کرنا ہوتی تھی۔ یہی وہ اصول اور قرینہ ہے جس کی بنا پر ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ شیخ انوار الحق پنڈوی نے بھی مقامی زبان میں درس و تدریس، رشد و ہدایت اور تبلیغ و تلقین کا کام کر کے ایک ایسی زبان کی تشکیل میں مدد دی ہوگی جو عربی فارسی اور اسلامی چھاپ لیے ہوئے ہوگی اور جس نے پوتھی ادب کے ذریعے اردوئے قدیم کے قریب آنے کی کوشش کی ہوگی۔ شیخ حسام الدین مانکپوری نے اپنے ملفوظات میں ان کے بعض ملفوظات کا بھی ذکر کیا ہے۔ شیخ حسام الدینؒ مانک پور میں رہتے تھے اور حضرت نور قطب عالمؒ کے مُرید اور خلیفہ تھے ان کے ملفوظات کے مجموعہ کا نام رفیق العارفین ہے۔

شیخ شرف الدین یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۷۸۲ھ)

شیخ شرف الدین یحییٰ مُنیریؒ بمقام مُنیر (ضلع پٹنہ، بہار) میں پیدا ہوئے[1]۔ آپ کا سلسلہ نسب چودھویں پشت میں حضرت امام جعفر صادق سے جا ملتا ہے۔ آپ کے آباؤ اجداد بیت المقدس سے آکر مُنیر میں آباد ہوئے تھے۔ شیخ نے جب علم ظاہری

---

[1] : تذکرہ صوفیائے بنگال از اعجاز الحق قدسی، ص ۲۸۲۔

کی تحصیل کرلی تو تلاش مرشد میں نکلے اور سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے بعیت کا ارادہ کیا لیکن ان کے فوت ہو جانے کی وجہ سے شیخ نجیب الدین فردوسیؒ کے مرید ہو گئے اسی لیے آپ خود اور ان کے مریدین فردوسی بھی کہلاتے ہیں۔ مرید ہونے کے بعد شیخ شرف الدینؒ نے بڑی ریاضتیں اور مجاہدے کیے اور اس طرح مقام فقر کی بلندیوں کو چھو لیا۔ وہ کثیر التصانیف بزرگ تھے۔ مولف بزم صوفیہ نے ان کی کئی کتابوں کے نام لیے ہیں[۱] جن میں ان کے مکتوبات وملفوظات بھی ہیں۔ ہندی اور پوربی زبان میں ان کے ایسے منتر بھی ملتے ہیں جن سے سانپ کے کاٹے کا زہر اتارنے اور آسیب سے چھٹکارا حاصل کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔ حامد حسن قادری نے داستان تاریخ اُردو میں لکھا ہے[۲] کہ ان کے خاندان میں بھی حضرت مُنیریؒ کا ایک ایسا منتر رائج ہے جس کی عبارت بڑی لمبی ہے اور اس کے آخر میں یہ دہرا ہے۔

کالا ہنسا نہ ملا بسے سمندر تیر
پنکھ پسارے بکھ ہرنے نرمل کرے سریر

حافظ محمود شیرانی نے پنجاب میں اُردو میں مولوی محبوب عالم کی بیاض کے حوالے سے ان کا ایک مندرہ دیا ہے[۳] جو دراصل مذکورہ منتر ہی ہے اور پوربی زبان میں ہے۔ اس میں شعری ربط اور ترتیب کا احساس نہیں ہوتا۔ اس منتر، مندرہ یا کچھ مندرہ میں ان کے دو ہندی دوہے بھی ہیں ایک تو وہی ہے جس کا اوپر ذکر ہوا ہے اور دوسرا یہ ہے۔

شرف حرف مائل کہیں درد کچھ نہ بسائے
گرد چھوئیں دربار کی سو درد دور ہو جائے

ان کے ملفوظات میں اُردو جملے بھی ملتے ہیں جو مگدھی سے مخلوط ہیں۔

مولوی عبدالحق نے کتاب اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام میں لکھا ہے

---

[۱] ، بزم صوفیاء از صباح الدین عبدالرحمن، ص ۲۵۰
[۲] ، داستان تاریخ اُردو از حامد حسن قادری، ص ۱۷
[۳] ، پنجاب میں اردو از حافظ محمود شیرانی، ص ۱۴۶

کہ؎۱

"شرف الدین یحیٰی منیریؒ پوربی اور ہندی بھاشا کے شاعر تھے اب تک ان کے بتائے ہوئے منتر سانپ، بچھو کا زہر اور سایہ کے اتارنے اور دفع امراض اور جھاڑ پھونک کے لیے پڑھتے ہیں جن کے آخر میں ان کی دہائی ہوتی ہے۔"

مولانا مظفر بلخی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۷۷۸ھ)

مولانا مظفر بلخیؒ صوبہ بہار کے ایک معروف بزرگ ہیں۔ ان کے آباؤ اجداد کا تعلق بلخ سے تھا۔ مولانا مظفر بلخیؒ نے تحصیل علوم ظاہری کے بعد باطن کو آراستہ کرنے کے لیے شیخ شرف الدین احمد یحیٰی منیریؒ کا دامن پکڑا اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ مرشد کے وصال کے بعد ان کے سجادہ نشین ہوئے۔ اپنے مرشد کی طرح وہ بھی کثیر التصانیف بزرگ تھے۔ دو سو کے لگ بھگ ان کے فارسی مکتوبات بھی ہیں جن کو مولانا عبدالرحمٰن بہاری نے اردو میں ترجمہ کر کے شائع کرا دیا ہے۔ فارسی متن بھی ساتھ ہے۔ مولانا مظفرؒ فارسی کے شاعر بھی تھے۔ اس زبان میں ان کا ایک دیوان شائع ہو چکا ہے شعر و کا انداز عارفانہ ہے۔ آپ کے ملفوظات کا ایک مجموعہ بھی موجود ہے۔ قدیم اردو کے کئی جملے اور ابیات ان سے بھی منسوب ہیں۔ مثال کے طور پر ان کا یہ دوہا دیکھیے

جی مگن میں ہے کہ آئی ہیں سہانی رتیاں
جن کے کارن تھے بہت دن سے بنائی بتیاں

شیخ شرف الدینؒ یحیٰی منیری نے شیخ مظفر کو ایسے بہت سے مکتوب لکھے ہیں۔ جن میں سلوک و معرفت کے اسرار و رموز ہیں۔ شیخ منیریؒ نے بعض مکتوبات کے نیچے خود لکھا تھا کہ ان کو کسی پر ظاہر نہ کرنا کیونکہ اس طرح کرنا ربوبیت کے راز کے افشا کا موجب ہوگا۔ شیخ مظفر کی وصیت کے مطابق یہ ان کے کفن کے ساتھ دفنا دیے گئے تھے پھر بھی بعض مکتوبات بچ رہے تھے جو معروف و مشہور ہیں۔ زبان سب کی فارسی ہے۔ شیخ شرف الدینؒ نے ان مکتوبات میں سے بعض میں شیخ مظفرؒ کو امام مظفر لکھا ہے۔

؎۱ : اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام، ص ۲۰

خواجہ اشرف جہانگیر سمنانی رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۸۹ھ)

خواجہ اشرف جہانگیر سمنانیؒ کا نام سیّد محمد اشرف اور جہانگیر لقب تھا[1] آل سمنان میں سے تھے اور پیدا بھی سمنان میں ہی ہوئے تھے۔ اسی لیے وہ سمنانی کہلاتے تھے۔ ان کے والد محمد ابراہیم سمنان کے بادشاہ تھے۔ کہتے ہیں کہ سیّد اشرفؒ ایک مجذوب کی دُعا سے پیدا ہوئے تھے کتاب لطائف اشرفی میں ان کے حالات میں لکھا ہے کہ صرف سات سال کی عمر میں سات قرأتوں کے ساتھ قرآن مجید حفظ کیا تھا اور چھوٹی ہی عمر میں علوم معقول و منقول کے بعد تمام ملک عراق میں شہرت حاصل کر لی تھی[2]

خواجہ اشرف جہانگیرؒ اپنے والد کی وفات کے بعد تخت نشین ہوئے لیکن طبیعت پر محبت الہٰی اس قدر غالب آ چکی تھی اور دین میں اس حد تک شغف بڑھ چکا تھا کہ ایک روز سلطنت چھوڑ کر فقیری اختیار کر لی اور دین و عرفان کے لیے وہ کام کیا جو وہ بادشاہ رہ کر نہیں کر سکتے تھے۔ کہتے ہیں کہ[3] ایک رات انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا جنھوں نے فرمایا کہ اگر سلطنت رکھنی چاہتے ہو تو یہ دنیا کی سلطنت چھوڑ کر ہندوستان جاؤ اور شیخ علاالحقؒ بنگالی کی خدمت میں حاضری دو وہ تم کو خدا تک پہنچا دیں گے اور ظاہر ہے یہ سلطنت خداداد دنیاوی سلطنت کے مقابلہ میں کتنی عظیم کتنی پائیدار اور کتنی دیر پا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اشارہ پا کر ماں کی اجازت سے اپنی سلطنت دنیا اپنے بھائی سلطان محمد کے سپرد کی اور سفر کرتے ہوئے اوچ شریف (ریاست بہاولپور) پہنچے۔ وہاں کچھ عرصہ مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے ساتھ صحبت رہی۔ مخدوم نے ان کو دیکھ کر کہا[4] "مدت کے بعد طالب صادق کی بو دماغ میں پہنچی ہے اور ایک زمانے کے بعد

---

[1] : بزم صوفیاء از صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۴۴۱ [2] : لطائف اشرفی جلد دوئم (بحوالہ بزم صوفیاء)، ص ۹۱۔ [3] : تذکرہ اولیائے بنگال از اعجاز الحق قدسی ص ۲۷۵ / ۳۱۵
[4] : لطائف اشرفی جلد دوئم (بحوالہ بزم صوفیاء)، ص ۹۲ / ۹۳ / ۹۴

گلزار سیادت سے نسیم چلی ہے۔ بیٹا تو بڑا مرد نکلا ہے۔ مبارک ہو۔ راستے میں جلدی قدم رکھو کہ میرے بھائی علاء الدین علاء الحق رح آپ کے منتظر ہیں۔

اوچ شریف سے خواجہ سمنانی رح دہلی آئے اور یہاں کے مشائخ کبار سے فیض یاب ہوئے۔ دلی سے صوبہ بہار گئے جب وہاں پہنچے تو مخدوم الملک شرف الدین احمد یحییٰ منیری رح وفات پا چکے تھے۔ جنازہ رکھا ہوا تھا۔ مخدوم مرحوم کی نصیحت یہ تھی کہ ان کا جنازہ وہ شخص پڑھائے جو صحیح النسب سیّد ہو۔ تارک السلطنت ہو اور ساتوں قرأتوں کا قاری ہو[۱]۔ یہ شرطیں سید اشرف جہانگیر سمنانی رح ہی کے لیے تو تھیں جن کی آمد کا ان کو غیب میں پتہ تھا۔ سیّد موصوف نے ان کا جنازہ پڑھایا۔ کچھ عرصہ ان کے مزار پر رہے اور پھر بنگال چلے گئے۔

شیخ علاء الدین علاء الحق رح ان دنوں بنگال میں رشد و ہدایت کا کام کر رہے تھے[۲]۔ انھوں نے سیّد اشرف جہانگیری سمنانی رح کی آمد سے کچھ عرصہ پہلے فرمایا تھا کہ وہ شخص جس کا میں دو سال سے انتظار کر رہا ہوں اور اس کی ملاقات کے لیے چشم براہ ہوں دو ایک دن میں پہنچنے والا ہے۔ جب سید اشرف جہانگیر سمنانی رح پنڈوہ (ضلع مالدہ بنگال) کے پاس پہنچے تو اس وقت شیخ علاء الدین رح قیلولہ فرما رہے تھے۔ یکایک اٹھے اور کہا دوست کی خوشبو آ رہی ہے۔ جب شیخ سمنانی رح خانقاہ پنڈوہ میں پہنچے شیخ علاء الحق نے گلے لگایا اور آغوش تربیت میں لے کر تھوڑے ہی عرصے میں منزل مقصود پر پہنچا دیا۔ خلافت عطا کی اور جہانگیر کا لقب بخشا۔ شیخ شرف الدین رح کو شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے صاحب کرامات اور صاحب تصرف بزرگ کہا ہے[۳]۔ شیخ سمنانی رح نے بڑے بڑے سفر کیے اور تقریباً ربع مسکون کی سیاحت کی۔ لطائف اشرفی جلد دوم کے لطیفہ سی و پنجم

---

[۱] : تذکرہ صوفیائے بنگال از اعجاز الحق قدسی، ص ۲۷۵ تا ۳۱۵

[۲] : بزم صوفیا از صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۴۴۴

[۳] : اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار از شیخ عبدالحق محدث دہلوی (فارسی)، ص ۱۶۶

میں ان کی سیر و سیاحت کے حالات تفصیل سے درج ہیں۔ اس دوران انھوں نے مشہور بزرگوں سے ملاقات کی۔ کسی سے فیض لیا اور کسی کو فیض دیا اور آخر کچھوچھہ شریف آکر ساری عمر کے لیے قیام کر لیا اور یہیں انتقال فرمایا۔

سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے برصغیر کے دوسرے علاقوں کے ابتدائی دور کے صوفیائے کرام کی طرح ہندوی زبان کو بھی تبلیغ و ارشاد کے لیے استعمال کیا ہے۔ انھی کوششوں سے بنگال میں بھی اُردوئے قدیم کے ابتدائی نقوش نظر آتے ہیں۔ وفا راشدی نے کتاب بنگال میں اُردو میں ان کے ایک دو ہندی ملفوظات کا ذکر کیا ہے[1]

ایک دفعہ "چھیری کے منہ کھنڈ اسمائے" کا جملہ استعمال کیا تھا۔ چھیری کے معنی ہیں بکری اور کھنڈا سے مراد ہے چاول کا چورا ۔ ایک اور موقع پر فرمایا تھا "سوالا کو سیانی بندھوں" یعنی باندھوں ان ملفوظات کی زبان اور سید اشرف جہانگیر سمنانی کے منہ سے ان کی ادائیگی اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ جو علماء اور بزرگ، دین کی اشاعت اور اسلام کی تبلیغ کا کام کرنا چاہتے تھے وہ خواہ کسی ملک یا ولایت سے وارد ہوئے ہوں ان کے لیے ہندوی یعنی مقامی بھاشا کا جاننا ضروری تھا ایسی بھاشا جو اس علاقے میں ضرور سمجھی جاتی ہو جہاں وہ تبلیغ کا کام کر رہے ہوں۔

سید جہانگیری سمنانیؒ قدیم بزرگانِ چشت میں سے وہ شخص ہیں جن سے ہندوی میں ایک نثری رسالہ بھی منسوب ہے۔ رسالہ نگار لکھنؤ دسمبر ۱۹۵۰ء میں میر نذر علی کاکوروی نے اس کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اشرف جہانگیر سمنانیؒ نے اپنے سلسلے کے ایک بزرگ مولانا وجیہہ الدینؒ کے ارشادات کو جو اس زمانے کی زبان ہندی میں تھے رسالہ کی صورت میں جمع کیا ہے۔ حامد حسن قادری نے کتاب داستان تاریخ اردو میں بھی اس کی تصدیق کی ہے[2]۔ اس رسالہ کی عبارت اس طرح کی ہے :

---

[1]: بنگال میں اُردو از وفا راشدی، ص ۶

[2]: داستان تاریخ اُردو از حامد حسن قادری، ص ۱۷/۱۸

"اے طالب آسمان و زمین سب خدا میں ہے۔ سب میں خدا ہے۔ جو تحقیق جان اگر تجھ میں کچھ سمجھ کا ذرّہ ہے تو صفات کے باہر بجیستر سب ذات ہی ذات"[1]

اس عبارت سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس دَور میں ہندوی کس قدر موجودہ اُردو کے قریب ہو چکی تھی۔

سیّد محمد یوسف المعروف بہ راجا رحمۃ اللّٰہ علیہ (متوفی ۷۳۱ھ)

سیّد محمد یوسف المعروف بہ راجاؒ (سیّد راجا)[2] جنوبی ہند کے مشہور چشتیہ بزرگ خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کے والد بزرگوار تھے۔ وہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے سلسلے کے بزرگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ جب سلطان محمد تغلق نے دولت آباد کو دارالحکومت بنایا تو سیّد محمد یوسفؒ بھی اپنے عزیز واقارب کے ساتھ دِلّی سے دکن آ گئے۔ اس وقت خواجہ بندہ نوازگیسو درازؒ کی عمر تقریباً پانچ سال تھی۔ جب وہ دس سال کے ہوئے تو سیّد محمد یوسفؒ انتقال کر گئے۔ خواجہ بندہ نوازؒ اس کے بعد اپنی والدہ کے ساتھ دوبارہ دہلی آ گئے اور پھر یہاں سے تحصیل علوم ظاہری اور فیضان باطنی کے بعد حضرت نصیرالدین چراغ دہلویؒ کے خلیفہ کی حیثیت سے آپ دوبارہ گلبرگہ (دکن) تشریف لے آئے۔ اس وقت فیروز شاہ بہمنی کی حکمرانی تھی۔

سیّد یوسفؒ عرف عام میں راجا یا سید راجا کے نام سے مشہور تھے۔ ایک اور راجا تھے جن کا پورا نام راجا رام تھا۔ وہ ریختہ گو شاعر بھی تھے[3] اور اڑھائی سو سال پہلے سورت (علاقہ گجرات) میں ہوئے ہیں۔ راجا اور راجا رام دونوں کی ہندوی گوئی

---

[1]: اردوئے قدیم از شمس اللہ قادری، ص ۴۳

[2]: دکن میں اُردو از نصیرالدین ہاشمی، ص ۲۵

[3]: مضمون راجہ رام از سیّد ظہیرالدین، رسالہ اُردو، ۱۹۴۴ء

سے دھوکا کھاکر بعض ان کو خلط ملط کر دیتے ہیں۔ یہ راجا رام ہندو تھے لیکن مشہور یہ ہے کہ وہ مسلمان ہو گئے تھے۔ ان کے کلام میں عارفانہ اور صوفیانہ مضامین اور مسلمانی عقائد کی موجودگی سے یہ بات کچھ قابل یقین نظر آتی ہے۔

سید محمد یوسف راجاؒ فارسی اور ہندوی دونوں زبانوں کے شاعر تھے۔ راجا ان کا عرف بھی تھا اور تخلص بھی۔ نصیر الدین ہاشمی نے اپنی تصنیف دکن میں اردو میں کہا ہے کہ انڈیا آفس لندن کے کتب خانہ میں ان کا ایک دیوان موجود ہے جس پر "دیوان راجہ ہندی" کا عنوان لکھا ہوا ہے یہ صرف سترہ[۱۷] ورق کا مختصر سا مجموعہ کلام ہے۔ ہاشمی کا خیال ہے کہ یہ فارسی غزلوں پر مشتمل ہے۔ ممکن ہے یہ مجموعہ مکمل نہ ہو اور اس میں کہیں ہندوی کلام بھی ہو کیونکہ صرف سترہ[۱۷] ورق کے مجموعہ کو دیوان کا نام دینا عجیب سا نظر آرہا ہے اور بعض اندرونی اور بیرونی شہادتوں سے ان کی ہندوی دانی اور ہندوی گوئی کا یقین بھی آتا ہے۔ ان کے بیٹے سید محمد بندہ نواز گیسو درازؒ کی زندگی کے حالات اس سلسلے میں ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں۔ جب خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ خلیفہ نصیر الدین چراغؒ کی ہدایت سے گلبرگہ پہنچے تھے تو یہ فیروز شاہ بہمنی کا زمانہ تھا۔ اس وقت جوگیوں اور یوگیوں کا بڑا زور تھا۔ مندروں کی موسیقی نے ہندو عوام کو مسحور کر رکھا تھا اس زور اور طلسم کو توڑنے کے لیے خواجہ بندۂ نواز گیسو درازؒ نے ہندوؤں کی زبان یہاں تک کہ سنسکرت بھی سیکھی[۱]۔ جوگیوں اور یوگیوں سے بحثیں اور مناظرے کیے۔ ان کی شعبدہ بازیوں کو کرامات سے توڑا اور ہندی موسیقی پر عبور حاصل کر کے اسے مندروں کے ہندوانہ اثرات سے آزاد کیا۔ اس میں سحر آفرین لے کاری پیدا کر کے مشرکوں اور بت پرستوں کو توحید کی آواز سننے کا شائق بنایا اور ہندی راگوں اور راگنیوں میں ایسے بول بھرے کہ غیر مسلم اپنے اوتاروں اور بتوں سے بیزار ہو گئے اور توحید کی لے میں مست ہو کر ایک خدا کی آرزو کرنے لگے۔

---

[۱]: آب کوثر از شیخ محمد اکرام، ص ۴۲۳

خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ اور ان کے خاندان کے دوسرے بزرگوں کے حالات میں
یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ دینی اور عرفانی مشاغل کے ساتھ ساتھ ان کا دھیان مقامی
زبان میں تبلیغ و تلقین کے لیے تحریریں تخلیق کرنے کی طرف بھی تھا۔ خواجہ بندۂ نوازؒ
کو ان میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان باتوں کی طرف رغبت
میں ان کے والد بزرگوار اور سید محمد یوسفؒ کا بھی ابتدائی عمل دخل ہوگا۔ اس سے خود
خواجہ محمد یوسف راجاؒ کی مقامی زبان کی طرف رغبت سے انکار ممکن نہیں۔ موروثی خصائص
اور والد گرامی کی تربیت نے جہاں خواجہ بندہ نوازؒ کو ہندوی آشنا کیا ہوگا، ان کا خود
ہندوی دان ہونا یقینی ہے۔

دکن میں ایک اور بزرگ اور دکنی زبان کے شاعر سید راجوؒ بھی ہوئے ہیں۔ ان
کو سید شاہ راجو کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے وہ خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کی اولاد
ہی سے تھے اور دکن کے اس وقت کے سلطان ابوالحسن تانا شاہ کے مرشد تھے۔ وفات
ان کی ۱۰۹۳ء میں ہوئی ہے اور مزار ان کا حیدرآباد (دکن) میں ہے۔ دکنی زبان
میں انھوں نے ایک مثنوی بنام تحفۃ النصائح بھی لکھی ہے۔ یہ مثنوی اسی نام کی ایک
اور مثنوی سے الگ ہے جسے قطب شاہی دور کے ایک شاعر قطبی نے تصنیف کیا
ہے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ مثنوی سید محمد یوسف دہلوی مرید خواجہ نصیرالدین دہلویؒ
کی لکھی ہوئی ہے جسے انہوں نے حیدرالدین ابوالفتح کے لیے ۱۰۹۳ء میں لکھا تھا
اور قطبی نے اسی کا دکنی زبان میں ترجمہ کیا ہے یہاں مختلف ناموں کا اختلاط مدِ نظر رکھنا
چاہیئے اور سید راجا کو ان سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیئے۔

امیر حسن سنجری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۷۳۸)

امیر حسن نام، حسن تخلص، حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ کے مرید اور
حضرت امیر خسروؒ کے پیر بھائی اور ہم عصر تھے۔ مولانا عبدالرحمٰن جامی نے اپنی تصنیف

بہارستان جامی میں انہیں "سعدی ہند" کہا ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے ملفوظات کا مجموعہ فوائد الفواد کے نام سے انہی نے مرتب کیا ہے۔ جن دنوں سلطان محمد تغلق نے دلّی کی بجائے دولت آباد کو پایہ تخت قرار دیا امیر حسن سنجریؒ بھی مشہور چشتیہ بزرگ خواجہ برہان الدین غریبؒ کے مریدوں اور مشائخ کے ساتھ دکن آگئے اور پھر ساری عمر یہیں رہے۔ ان کا مزار خلد آباد (دکن) میں ہے اور اس نواح کے لوگ انہیں حسن شیر کے نام سے یاد کرتے ہیں[1]

شیخ برہان الدین غریبؒ اور امیر خسروؒ کی ہندی دانی کے پیشِ نظر امیر حسن سنجری کا ہندوی (اُردوئے قدیم) جاننا اور اس کو کام میں لانا بعید از قیاس نہیں اور پھر وہ شاعری میں امیر خسروؒ کے متبّع بھی تو تھے، بے شک یہ اتباع فارسی کی حد تک تھا لیکن ان کی ریس میں اگر ہندوی شاعری یا ریختہ کی طرف بھی توجہ کرلی ہو تو کچھ عجب نہیں۔ میر تقی میر نے نکات الشعرا میں حسن نامی ایک شاعر کا یہ شعر نقل کیا ہے جو ممکن ہے انہی امیر حسن کا ہو۔ شعر یہ ہے[2]

جب تے سفر پی نے کیا تب تے غریب آوارہ ہوں
پی بیگ تے آنا کریں یا مج کو لیں بلوائے کر

سخاوت مرزا نے اُردو کی ایک قدیم بیاض کے حوالے سے اس غزل کے چند[3] اور شعر امیر حسن سنجریؒ ہی کے نام سے منسوب کیے ہیں، اس سے یقین ہو جاتا ہے کہ میر کے نکات الشعراء کا شعر بھی ان کا ہی ہے۔

ہر لحظہ آید در دلم دیکھوں اسے ٹک جائے کر
گویم حکایت ہجر خود با آں صنم جیو لائے کر

---

[1] : تذکرہ شعرائے دکن جلد اوّل از عبدالجبار ملکاپوری (ذکر امیر حسن)

[2] : نکات الشعراء از میر تقی میر، ص ۱۰۴

[3] : مضمون قدیم اُردو کی ایک نایاب بیاض از سخاوت مرزا، رسالہ اردو، اپریل ۱۹۵۱ء

آں سیم تن گوید مرا درکوئے ما آئی چرا
ماہی صفت تڑپھوں پڑا جوتک نہ دیکھوں جائے کر

اس غزل کی خصوصیات امیر خسروؒ کے ریختہ سے مطابقت رکھتی ہیں۔ میر تقی میر نے نکات الشعراء کے آغاز میں ریختہ کی اس قسم کو قبیح کہا ہے جس میں فارسی کے حروف وافعال کام میں لائے جاتے ہیں۔ اس قسم کا ریختہ دلی کے ابتدائی شاعروں نے لکھا ہے خواجہ عطاء اللہ کا ریختہ اسی قسم کا ہے لیکن امیر خسروؒ اور امیر حسنؒ نے ریختہ کی ان اقسام کو استعمال کیا ہے جن میں ایک مصرع فارسی اور ایک ہندوی یا نصف مصرع فارسی اور نصف ہندوی ہو اور یہ قباحت کے دائرے میں نہیں آتا۔

خواجہ برہان الدین غریب رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۷۴۱ھ)

شیخ برہان الدین غریبؒ سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے خلیفہ تھے۔ مولد و موطن ان کا ہانسی تھا لیکن وہ کسب فیض روحانی اور حصول علوم شرعی و دینی کے لیے دہلی آ گئے تھے۔ ان کے حقیقی بھائی شیخ منتخب الدین بھی ان کی طرح سلطان المشائخ کے مرید اور خلیفہ تھے۔ شیخ فرید الدین گنج شکرؒ کے خلیفہ حضرت جمال الدین ہانسویؒ ان کے حقیقی ماموں تھے۔ یہ وہی جمال الدینؒ ہیں جن کو بابا فریدؒ بہت چاہتے تھے اور جن سے تصوف کے چشتیہ سلسلے کی ذیلی شاخ جمالیہ شروع ہوئی ہے ان رشتوں اور عظمتوں سے حضرت برہان الدین غریبؒ کی اپنی رفعت درجات کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

سلطان محمد تغلق نے جب دولت آباد کو دارالسلطنت بنایا تو حضرت برہان الدین غریبؒ بھی بہت سے درویشوں کے ساتھ دولت آباد آ گئے۔ حضرت امیر حسن سنجریؒ بھی اس قافلے میں شامل تھے یہاں پہنچ کر بھی حضرت برہان الدین غریبؒ اور ان کے حلقہ کے مشائخ نے تبلیغ دین اور اصلاح احوال قلب و معاشرہ کا کام جاری رکھا جس سے جنوبی ہند کے بے شمار لوگوں کو دینی اور روحانی فائدہ پہنچا حضرت برہان الدین غریبؒ تادم مرگ

دکن ہی میں رہے اور یہیں وفات پائی۔[1]

خواجہ برہان الدین غریبؒ کے مریدوں میں سے ایک مرید شیخ رکن الدین بن عماد کاشانی نے ان کے ملفوظات نفائس الانفاس کے نام سے جمع کیے ہیں۔ اس کے علاوہ دو اور مجموعے حصول الوصول اور ہدایت القلوب کے نام سے بھی ہیں جن میں شیخ کے ہندی جملے بھی ہیں۔[2]

ایک دن حضرت برہان الدین غریبؒ کو حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کی ایک صاحبزادی نے ملتانی زبان میں کہا تھا "برہان الدین ساڈی دھیہ کہ کہیا ہسندا ہے" اس سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ برہان الدین غریبؒ عربی اور فارسی زبانوں کے علاوہ مقامی زبان سے بھی آشنا تھے۔ انھوں نے شمائل الاتقیا کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس کا دکنی زبان میں ترجمہ ایک بزرگ میراں یعقوب نے کیا ہے۔ قاموس الادب نمبر ۷۸۵ پر اس کا حوالہ موجود ہے۔ فہرست کتب خانہ خاص مولوی عبدالحق میں بھی شامل ہے۔ کتاب ضخیم ہے جسے چار قسموں اور نوے ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس میں توبہ، عمل حمیدہ ہدایت دارشاد، معجزہ وکرامت، حکمت بیعت، آداب مرید، حکم نماز، علمائے نیک استقامت وغیرہ کے متفرق و متنوع موضوعات ہیں۔ اس کتاب کو مصنف نے تفسیر کی پندرہ، حدیث کی نو، فقہ کی بیس اور کئی دوسری کتابوں کی مدد سے مرتب کیا ہے اور دین و عرفان کے اہم موضوعات پر روشنی ڈالی ہے۔ اس ترجمہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ شیخ برہان الدین غریبؒ نے خود میراں یعقوب کو ہندی میں ترجمہ کرنے کے لیے کہا تھا جس سے ان کی ہندی سے رغبت کا پتہ چلتا ہے چاہے یہ تبلیغی تقاضے کے تحت

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے۔
اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار از شیخ عبدالحق محدث دہلوی (مدینہ پبلشنگ) اردو ترجمہ، ص ۲۰۴

[2] اردوئے قدیم از شمس اللہ قادری، ص ۹

ہی کیوں نہ ہو۔ میراں یعقوب لکھتے ہیں کہ "اپنی حیات کے وقت فخ اشارت کیے تھے جوں شمائل الاتقیا کتاب کو ہندی زبان میں لیاوے تا ہر کسی کو سمجھا جاوے۔ مرتضیٰ کے نین شاہ میراں ابن سید حسین سلمہ اللہ تعالیٰ کی خلافت کے زماں میں کتاب لکھنے کا کام شروع کیا جو کچھ مشکل نظر آتا تھا سوں پیر کی مدد سوں آسان لکھا جاتا تھا"[1] اس نمونے سے اس وقت کی قدیم اُردو کے خدوخال کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

حضرت زین الدین خُلد آبادی رحمۃ اللہ علیہ (۷۰۱ھ تا ۷۷۱ھ)

حضرت زین الدین کا تعلق خلد آباد (دکن) سے تھا۔[2] وہ جنوبی ہند کے اولیائے عظام میں سے تھے۔ خُلد آباد کسی زمانے میں مشاہیر علماء اور اولیاء کا گہوارہ رہا ہے۔ رونق علی نے روضۃ الاقطاب (تاریخ خُلد آباد) کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں اس خطہ برگزیدہ کے حالات ہیں وہ حضرت زین الدینؒ کے متعلق لکھتے ہیں کہ[3] "جب آپ کا نزع کا وقت قریب آیا تو آپ کے مریدوں نے آپ کو کچھ وصیت کرنے کے لیے عرض کی"۔ غالباً ان کی مراد جانشین مقرر کرنے کی تھی۔ آپ نے کچھ جواب نہ دیا بلکہ منہ دوسری طرف کر لیا جو اس بات کے بارے میں اظہار تھا کہ ان سے اس بارے میں کچھ نہ پوچھا جائے لیکن اس اشارے کے پانے کے باوجود ان کے ایک مرید نصیر الدین بدلیری نے دوبارہ وہی سوال کیا تو آپ نے کہا "منجھے مت بلاؤ"۔ یہ فقرہ اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ اس زمانے میں علماء اور دوسرے لوگ آپس میں مقامی زبان میں بھی گفتگو کرتے تھے اور یہ خیال عبث ہے کہ سوائے عربی فارسی کے وہ کسی اور زبان میں بات چیت نہیں کرتے تھے۔ مؤرخ اور تذکرہ نگار اس زبان کو ہندی کہتے ہیں بعض بھاکا یا بھاشا بھی کہتے ہیں مراد

---

[1]: دکن میں اُردو از نصیر الدین ہاشمی، ص ۱۰۱

[2]: دکن میں اُردو از نصیر الدین ہاشمی، ص ۱۶

[3]: دکنی کلچر از نصیر الدین ہاشمی، ص ۵۶

ان کی زبان اہل ہند سے ہوتی تھی نہ کہ وہ ہندی جو آج ہندوؤں میں رائج ہے۔ پُرانے تذکرہ نگاروں نے پنجابی دکنی گوجری اور دیگر کئی علاقائی زبانوں کے لیے یہی لفظ ہندی استعمال کیا ہے یہاں تک کہ اہل اُردو بھی اپنی زبان کو ہندی کہتے رہے ہیں۔ زین الدین خلد آبادیؒ نے بھی جو زبان استعمال کی ہے وہ چاہے دکنی ہو یا گوجری یا کوئی اور لیکن اسے مذکورہ بالا اصول کے تحت ہندی یا ہندوی ہی کہا جائے گا۔ جو اُردو کی قدیم شکل ہے۔

شیخ عین الدین گنج العلم رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۷۹۵ھ)

شیخ عین الدین گنج العلمؒ جنوبی ہند کے اولیائے کرام اور علمائے عظام میں سے تھے، مولد ان کا دلیؔ ہے۔ تحصیل علم گجرات میں بھی کی ہے۔ دلی سے وہ دولت آباد (جنوبی ہند) آگئے جو اس وقت دارالحکومت بھی تھا اور علماء و مشائخ کا گہوارہ بھی۔ ارادت ان کی سید خوندمیرؒ سے تھی۔ بعض دوسرے اولیاء سے بھی فیض حاصل کیا تھا آخری عمر میں بیجاپور آگئے تھے۔ انہوں نے سلطان محمد شاہ ثانیؒ کے زمانے میں انتقال فرمایا۔ روضۃ الاولیائے بیجاپور کے مصنف نے کہا ہے کہ علوم متداولہ پر ان کی بہت سی تصانیف ہیں جن کی تعداد تذکروں میں ایک سو بتیس (۱۳۲) کے قریب دی ہوئی ہے[۱]۔ انہوں نے قاضی منہاج الدین جوزجانی کی مشہور تصنیف طبقات ناصری کا تکملہ بھی لکھا تھا۔ فرشتہ نے اپنی تاریخ کے لیے اس سے مضامین اخذ کیے ہیں اور اس کا نام ملحقات طبقاتِ ناصری رکھا ہے[۲]۔

شیخ عین الدین گنج العلم نے دکنی زبان میں بھی چھوٹے چھوٹے رسالے تصنیف کیے ہیں، ان میں سے تین رسالے سینٹ جارج کالج کے کتب خانہ میں موجود ہیں جن کے صفحات کی کل تعداد چالیس کے قریب ہے[۳]۔ ان میں دینی اور شرعی مسائل خصوصاً فرائض

---

[۱]: اردوئے قدیم از شمس اللہ قادری، ص ۴۲

[۲]: اردوئے قدیم از شمس اللہ قادری، ص ۴۳

[۳]: اُردوئے قدیم از شمس اللہ قادری، ص ۳۱ (نیا ایڈیشن)

وسنن وغیرہ درج ہیں۔ شمس اللہ قادری نے اُردوئے قدیم میں انہیں دکن کا سب سے پہلا اُردو مصنف کہا ہے نصیر الدین ہاشمی نے کتاب دکن میں اُردو میں حضرت بندہ نواز گیسو دراز کو اُردو کا پہلا مصنف کہا ہے[1] لیکن زمانے کے اعتبار سے شیخ عین الدین گنج العلم کو اوّلیت دینی پڑتی ہے[2] کیونکہ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کا عرصہ عمر ۱۳۲۱ تا ۱۴۲۲ ہے اور شیخ عین الدین گنج العلم کا ۱۳۰۶ سے ۱۳۹۳ / ۱۳۹۶ تک۔

سیّد محمد عبد اللہ حسینی رحمۃ اللہ علیہ

سیّد محمد عبد اللہ حسینی، حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے نبیرہ تھے اور سلطان احمد ثانی بہمنی کے زمانے میں موجود تھے[3] اپنے خاندان کے دوسرے بزرگوں کی طرح وہ بھی صاحب تصنیف بزرگ گزرے ہیں۔ انھوں نے سیّد عبد القادر جیلانی کی کتاب نشاط العشق کا دکنی نثر میں ترجمہ کیا ہے اور اس کی شرح بھی لکھی ہے۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ ٹیپو سلطان میں محفوظ ہے۔ کتاب کا موضوع عرفان و معرفت ہے[3]۔

دکن میں حضرت عبد القادر جیلانی (غوث الاعظم) کے حالات و مناقب میں اگرچہ افضل نے محی الدین نامہ اور شاہ حسین ذوقی نے غوث نامہ جیسی منظوم تصانیف دکنی زبان میں لکھی ہیں لیکن سیّد محمد عبد اللہ حسینی کے ترجمہ کی نوعیت بالکل جداگانہ بلکہ منفرد اور یگانہ ہے کیونکہ یہ سیّد عبد القادر جیلانی کی اپنی تصنیف کا دکنی ترجمہ ہے۔ نہ کہ کسی دوسرے کی کتاب کا۔ سیّد محمد عبد اللہ حسینی نے نشاط العشق کے مضامین کی تشریح میں جو حاشیے لکھے ہیں وہ ان کے اپنے خیالات و افکار کے ترجمان ہیں اور متن حضرت غوث الاعظم کا ہے۔

---

[1]: دکن میں اُردو از نصیر الدین ہاشمی (مطبوعہ ۱۹۳۶)، ص ۲۷

[2]: دکن میں اُردو از نصیر الدین ہاشمی (حیدرآباد دکن ۱۹۳۶، ایڈیشن)، ص ۳۷

[3]: فہرست کتب خانہ ٹیپو سلطان (ص ۱۸۴) بحوالہ اردوئے قدیم از شمس اللہ قادری، ص ۶۷

دکنی زبان میں ایک کتاب شمائل الاتقیاء کا نثری ترجمہ میراں یعقوب سے یادگار ہے جو قطب شاہی دور کے عالم اور نثر نگار تھے۔ شمائل الاتقیاء حضرت برہان الدین کی فارسی تصنیف ہے جو سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء کے خلیفہ تھے۔ اس کتاب کو میراں یعقوب نے اپنے پیر و مرشد برہان الدینؒ کے اشارے پر فارسی سے دکنی نثر میں ڈھالا تھا یہ ترجمہ سید محمد عبداللہ کے ترجمہ سے بہت بعد کا ہے۔ سید محمد عبداللہ حسینیؒ کا تعلق بہمنیہ دور سے ہے، جس وقت دکنی زبان اپنے ابتدائی مراحل میں تھی۔ شیخ عین الدین گنج العلمؒ حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ اور سید محمد عبداللہ حسینیؒ اس دور کے تین ایسے بزرگ ہیں جنہوں نے دکنی زبان میں مذہب اور تصوف کے موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ ان لوگوں کی علمی اور روحانی حیثیت کے علاوہ تاریخ لسانیات میں بھی اہمیت ہے۔ یہ بزرگ اردوئے قدیم کے نقیب ہیں۔[1]

سید محمد حسینی خواجہ بندہ نواز گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۸۲۵ھ)

خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ اپنے زمانے کے صوفیائے کرام اور اولیائے عظام میں سے تھے۔ خاص طور پر جنوبی ہند میں تو ان کے پائے کا کوئی بزرگ نہیں تھا۔ وہ پیدا تو دلی میں ہوئے لیکن پایہ تخت کی منتقلی کے سلسلے میں اپنے والدین کے ساتھ دولت آباد آ گئے اور ابھی وہ بچے ہی تھے کہ ان کے والد فوت ہو گئے اور وہ اپنی والدہ کے ساتھ دوبارہ دلی آ گئے۔ یہاں وہ مشہور چشتیہ بزرگ خواجہ نصیر الدین چراغ دہلویؒ کے مرید ہو گئے۔[2] علوم عقلیہ و نقلیہ میں بہت کچھ حاصل کرنے کے بعد جب روحانی دولت بھی ہاتھ آ گئی تو مرشد سے خرقہ خلافت پا کر ۸۱۵ھ میں سلطان فیروز شاہ بہمنی کے زمانے میں دوبارہ جنوبی ہند تشریف لے آئے اور گلبرگہ میں قیام کیا۔ ان کا وصال یہیں ہوا اور یہیں ان کا مزار ہے۔

خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کے علمی اور روحانی مرتبہ کا اندازہ ان کے مریدوں، خلفاء اور

---

[1] اردوئے قدیم از شمس اللہ قادری، ص ۴۴

[2] اردوئے قدیم از شمس اللہ قادری، ص ۴۴

اولاد کی کثرت اور ان کی تصانیف کے متنوع موضوعات سے ہو سکتا ہے۔ قرآن مجید کی تفسیر بھی انہوں نے فارسی زبان میں لکھی ہے۔ علامہ زمخشری کی کتاب الکشاف پر بھی فارسی میں حاشیہ لکھا ہے[1]۔ شیخ محمد بن اسحٰق الکا باذی متوفی ۳۸۱ھ کی عربی کتاب التصوف، شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی تصنیف عوارف المعارف، امام قشیری کے رسالہ قشیریہ اور شیخ محی الدین ابن عربی کی کتاب فصوص الحکم کی شرحیں عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں لکھی ہیں[2]۔ تصوف کے موضوع پر ان کی تقریباً تیس کتابیں ہیں جن میں زیادہ تر فارسی زبان میں ہیں اور باقی عربی اور دکنی میں۔

مولف روضۃ الاولیاء نے لکھا ہے کہ خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ نماز ظہر کے بعد طلباء اور مریدوں کو علم تصوف اور حدیث کا درس دیا کرتے تھے جو لوگ عربی اور فارسی سے ناواقف تھے ان کے لیے آپ دکنی زبان میں تقریر فرمایا کرتے تھے[3]۔ خواجہ بندہ نوازؒ نے خود اپنی فارسی تصنیف اسماء الاسرار میں لکھا ہے کہ میں نے ایک محبوبہ کے مکالمے کو ہندی سے فارسی کا روپ دیا ہے[4]۔ مریدوں کی فرمائش پر انہوں نے دکنی نثر میں چھوٹے بڑے رسالے بھی لکھے ہیں۔ ان میں سے ایک رسالے کا نام معراج العاشقین ہے جو مولوی عبدالحق کے مقدمہ کے ساتھ انجمن ترقی اُردو کی طرف سے شائع بھی ہو چکا ہے کتاب کا موضوع تصوف و عرفان ہے اور زبان قدیم اُردو یعنی دکنی ہے۔

معراج العاشقین کے علاوہ ان کے دوسرے رسالے ہدایت نامہ، عشق نامہ، تلاوت الوجود، درالاسرار، شکار نامہ، تمثیل نامہ، ہشت مسائل، سہ بارہ وغیرہ کے نام سے ہیں[5]۔ مولوی

---

[1] : اردوئے قدیم از شمس اللہ قادری، ص ۴۴

[2] : تذکرہ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز از اقبال الدین احمد (مکمل حالات کے لیے)

[3] ، اُردوئے قدیم از شمس اللہ قادری (ذکر بندہ نواز گیسو دراز)

[4] ، مضمون خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے چند ہندی گیت از سخاوت مرزا رسالہ قومی زبان جولائی ۱۹۵۲ء

[5] : مخطوطہ ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد دکن۔

عبدالحق نے اپنی کتاب اُردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام میں لکھا ہے کہ ان میں سے اکثر رسائل ان کے پاس موجود ہیں[۱]۔ خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ نے دکنی زبان میں سات معولے ارشاد فرمائے تھے۔ ان کے ایک مرید نے ان کی مبسوط شرح لکھی ہے اور اس کا نام ہفت اسرار رکھا ہے[۲] تلاوت الوجود، شکار نامہ اور سہ بارہ کتب خانہ سالار جنگ میں بھی موجود ہیں۔ درا الاسرار کا ذکر فہرست اردو مخطوطات جلد اوّل میں موجود ہے۔

خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ شعر بھی کہتے تھے اور ان میں کبھی سید محمد، کبھی شہباز اور بعض اوقات بندہ تخلص استعمال کرتے تھے[۳] شہباز حسین کے نام سے ایک اور بزرگ بھی دکن میں گزرے ہیں جن کا سن وفات ۱۰۱۵ھ ہے اور جو ہدایت اللہ حسینی کے خلیفہ تھے ان کے علاوہ ایک بزرگ ملک شرف الدین شہباز بھی تھے جو ۹۴۴ھ میں فوت ہوئے ہیں۔ وہ حضرت شاہ عالم گجراتی کے خلیفہ تھے ان بزرگوں کے تخلص کو بندہ نواز گیسو درازؒ کے تخلص شہباز سے الگ سمجھنا چاہیئے۔

خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کی زیادہ تر ہندی (دکنی) شاعری موسیقی یعنی راگ راگنیوں کے تابع ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خواجہ صاحب کو موسیقی کے اسرار و رموز سے گہری واقفیت حاصل تھی اور وہ جانتے تھے کہ کون سا شعر، کون سی تال کس وقت، کس موسم، کس مقام اور کس انداز میں کارگر ہو سکتی ہے۔ شعر میں اثر انگیزی کی اسی کیفیت کے تحت خواجہ صاحب نے موسیقی یعنی راگ راگنیوں کے فن کو سیکھا اور اسے شاعری میں استعمال کیا۔ صوفیائے چشت نے سماع سے بھی یہی کام لیا ہے اور ان میں سے چند اہم بزرگ اسی لیے موسیقی کے فن میں یکتا ہوئے ہیں۔ اس فنی اثر انگیزی کو خواجہ میر دردؒ جیسے نقشبندیہ بزرگ نے بھی تسلیم کیا ہے اور اس سے کام لیا ہے۔ ان کے والد خواجہ ناصر عندلیبؒ اور ان کے

---

[۱]: اُردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیا کرام کا کام، ص ۲۳

[۲]: اُردوئے قدیم از شمس اللہ قادری، ص ۶۷

[۳]: مضمون حضرت خواجہ بندہ نواز کی ہندوستانی شاعری (کتاب مقالاتِ ہاشمی) از نصیر الدین ہاشمی، ص ۱۱

مرشدؒ شاہ گلشن دہلویؒ کا بھی یہی حال تھا۔ خواجہ بندہ نوازؒ گیسو درازؒ کے اس شعر کو دیکھیے عام آدمی کے لیے یہ صرف شعر ہے لیکن آشنائے فن کے نزدیک یہ راگ "رام کلی" کے سُر تال میں ہے ؎

مخفی نانوں معشوق رکھ ظاہر شہباز کہلائے
عشق کے جینی چند بند، اپنی آپ دکھائے

بند سماع یا بند مجرے کے وقت کے ان کے شعر بھی سینہ بہ سینہ چلے آتے ہیں اور گائے جاتے ہیں مثلاً اس بول کو دیکھیے۔

"اُٹھ سہاگن سیجا سے تیرا لالہ نہ جاگے"

وہ اشعار جو چکی گھماتے ہوئے الاپنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں ان کے مجموعہ کو چکی نامہ کہتے ہیں۔ خواجہ بندہ نوازؒ نے بھی ایسے شعر لکھے ہیں۔ محی الدین قادری زور نے فہرست اُردو مخطوطات جلد اوّل میں ان کے ایک چکی نامہ کا ذکر کیا ہے۔ خواجہ بندہ نواز کے کچھ اشعار حقیقت کے عنوان سے بھی ہیں جن کی ہیئت مثلث کی ہے۔ یہ بھی دوسرے اشعار کی طرح عرفانی جذبات اور صوفیانہ احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

او معشوق بے مثال نور نبیؐ نہ پایا
اور نور نبی رسولؐ کا میرے جی کو بھایا
اپیں اپیں دکھاونے کیسی آرسی لایا

سلطان ابراہیم عادل شاہ نے جو موسیقی کا عاشق اور اس فن کا ماہر تھا نورس کے نام سے ایک کتاب میں ہندی راگ راگنیوں کے تحت جو شعر یا بول لکھے ہیں ان میں انھوں نے خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کو بزرگ ہونے کے ساتھ ساتھ موسیقی داں کی حیثیت سے بھی یاد کیا ہے جس سے خواجہ موصوف کے ہندی موسیقی میں مقام کا اندازہ ہوتا ہے نورس میں جن راگ اور راگنیوں کی صراحت ہے ان میں بھوپالی، نوروز، رس، بھیردیں، کینرویسے، پورنا، برابنہ، ملار، نوزی، گوری، کلیان، بین، ابھوک وغیرہ ہیں جن سے آج بہت کم لوگ آشنا ہیں اور جن کی باریکی اور گہرائی سے آشنائی خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ اور سلطان ابراہیم عادل شاہ کی موسیقی کے فن میں مہارت تامہ کا پتہ دیتی ہے۔ خود خواجہ

بندہ نوازؒ نے ہندی موسیقی کے متعلق جو رائے دی ہے وہ قابل غور ہے۔ فرماتے ہیں کہ ہندی کی چیزیں نرم، لوچ دار، اور دل میں رقت پیدا کرنے والی ہوتی ہیں اور اس کا راگ بھی نرم ہوتا ہے اور طبیعت میں عاجزی اور مسکنت پیدا کرتا ہے[1]۔ یہی بات تھی جس نے خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کو فارسی شاعری اور اس کے سماع کا شائق ہونے کے باوجود ہندی شاعری اور اس کی موسیقی کی طرف راغب کیا۔ یہاں ذاتی شوق کے ساتھ ساتھ وسیع معاد کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ خواجہ بندہ نواز کا مقابلہ ہندو عالموں، پنڈتوں، پروہتوں، سادھوؤں جوگیوں اور یوگیوں سے تھا معاشرے پر ان کی مضبوط گرفت تھی، ان کو شکست دینے کے لیے خواجہ موصوف نے ہندی زبان، ہندی موسیقی بلکہ سنسکرت تک سیکھی کیونکہ یہاں کے غیر مسلموں کی زبان، ان کی پسند کی چیزوں اور ان کے مذہبی رجحانات سے واقفیت کے بغیر ان پر اثر انداز ہونا مشکل تھا۔ اس منصوبہ بندی سے انہوں نے ہندؤں کے گرد پنڈتوں پروہتوں اور جوگی یوگیوں کے مضبوط حصار کو توڑ دیا اور عوام کے دلوں تک پہنچ کر ان کو کفر کی ظلمت سے نکال کر اسلام کے نور میں داخل کر دیا اس کے لیے انہوں نے ہندی اور سنسکرت زبانوں[2] اور ہندی سماع اور موسیقی کو اس خوبی سے غیر مسلموں پر اثر انداز ہونے کے لیے استعمال کیا کہ مندروں کی گھنٹیوں میں مست اور گوپیوں کے رقص سے مسحور عوام کو توحید کی مدھر دھنوں سے مدہوش کر دیا۔ خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کی ہندی دانی اور فن موسیقی پر دسترس حاصل کرنے کے پیچھے یہی عظیم مقصد کارفرما تھا ورنہ وہ تو فارسی سماع کو پسند کرتے تھے۔ انہوں نے جہاں ہندی سماع اور ہندی راگ کے اثرات کا ذکر کیا ہے، یہ بھی کہا ہے کہ موسیقی کے فن اور موسیقار کے جذبات کا اظہار فارسی ہی میں بہتر طریقہ پر ہوتا ہے اور اس میں کچھ اور ہی لذت اور ذوق ملتا ہے[3] لیکن اس ذاتی رغبت سے چونکہ عظیم تر مقصد کو نقصان

---

[1] : رود کوثر از شیخ محمد اکرام، ص ۴۲۳

[2] : رود کوثر، ص ۴۲۳

[3] : رود کوثر، ص ۴۲۳

پہنچنے کا اندیشہ تھا اس لیے انھوں نے ہندی موسیقی کا راستہ بھی اپنایا کیونکہ عربی فارسی سے ناواقف ہندو اور نو مسلم جو موسیقی کے رسیا اور گیتوں کے پرستار تھے عربی فارسی شعراور راگ کے رائج رہنے کی بناء پر لازمی طور پر اپنے ذوق کی تسکین سے محروم رہتے اور صوفیاء کی طرف رجوع نہ کرتے یہاں یہ بات پھر یاد دلائی جاتی ہے کہ صوفیاء کے نزدیک موسیقی سے مراد حسن صوت ہے جس کے لیے مناسب سُر تال میں الفاظ اور بول مہیا کیے جاتے ہیں نہ کہ حسن ساز ۔ ان کا ساز سے نہیں آواز سے تعلق ہے۔[1]

خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کی نثر کے مندرجہ ذیل نمونوں کو دیکھیے :

(۱) " تحقیق خدا کے میانے ستر ہزار پردے اجیالے کے ہور اندھیارے کے اگر اس میں نے پردہ اُٹھ جاوے تو اس کی آنچ نے تے میں جلوں"۔

(۲) " ایمان کا جیو قرآن، ایمان کی جڑ توبہ، ایمان کی ڈالیاں بندگی، ایمان کے پات پرہیزگاری، ایمان کا تخم سو علم، ایمان کا پوست سو شرم، ایمان کا وطن سو مومن کا دل"۔

شاعری کا مزید نمونہ

(۱) سوئے عاشق شہباز ہے دو ہوں جگ کھلارا
خواجہ نصیر الدین سائیاں پنت راکھے ہمارا

(۲) خواجہ نصیر الدین جنے سائیاں پیو بنائے
جیو کا گھونگھٹ کھول کر پیا مکھ آپ دکھائے

مولوی عبدالحق نے یہ اشعار لکھ کر کہا ہے کہ یہ راگ راگنیوں میں ہیں۔ اس سے پہلے راگ رام کلی کے تحت جو شعر گزر چکا ہے مولوی موصوف نے اس کا بھی ذکر کیا ہے۔[2] ان کی قدیم ریختہ کی شکل میں ایک غزل ہے جس کا مطلع یہ ہے[3]

---

[1] ۔ اردو کے اسالیب بیان از محی الدین قادری زور، ص ۵
[2] ۔ اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام، ص ۲۵
[3] ۔ پوری غزل اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام میں دیکھیے، ص ۲۴

تون توصحی ہے لشکری کر نفس گھوڑا سار توں
ہوئے نرم نہ تجھ اور چڑے پیس کھائے گا آزار توں

سیّد اکبر حسینیؒ رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۸۱۲ھ)

سیّد اکبر حسینیؒ خواجہ بندہ گیسو درازؒ کے فرزند تھے اسی سے ان کی عظمت و وقار کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ سیّد اکبر حسینیؒ نے جس درویشانہ فضا اور عالمانہ ماحول میں پرورش پائی۔ اس سے وہ علمی اور روحانی دونوں اعتبار سے کندن بن گئے تھے۔ ان کی پیدائش تو دلّی کی ہے لیکن وہ گلبرگہ (دکن) آگئے تھے۔ بیعت وہ اپنے والد بزرگوار سے تھے خرقہ خلافت بھی انہیں سے حاصل کیا تھا اور انہی کے نقشِ قدم پر رہ کر جنوبی ہند میں تبلیغ دین اور اصلاح معاشرہ کا کام کیا تھا۔ "تذکرہ خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ" کے مصنف اقبال الدین احمد نے سیّد اکبر حسینیؒ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کا وصال ۸۱۲ھ میں ہو گیا تھا اس لیے وہ جائداد کے وارث نہ بن سکے[1]۔ عبدالجبار ملکاپوری نے بھی "تذکرہ اولیائے دکن" میں کہا ہے[2] کہ وہ اپنے والد کی زندگی ہی میں ۸۱۲ھ میں فوت ہو گئے تھے۔

سیّد اکبر حسینیؒ کو دکنی نظم اور نثر دونوں سے دلچسپی تھی۔ مولوی محمد یافعی نے ان کے ارشادات پر مشتمل ایک کتاب شائع کی ہے جو نظم و نثر کے ملے جلے انداز میں ہے موضوع عرفان و معرفت اور رشد و ہدایت ہے اور زبان تقریباً وہی ہے جسے جملہ اولیائے دکن نے استعمال کیا ہے۔ مثال کے طور پر اس نثر پارہ کو دیکھیے۔

"سنو اے مسلمانوں طالب خدا کے بوجھو، زندگی سہل ہے۔ جیوں کا بھروسہ نہیں۔"

---

[1] "تذکرہ خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ"، ص ۲۰۰

[2] "تذکرہ اولیائے دکن از عبدالجبار ملکاپوری، ص ۹۴۶

شعر دیکھیے:

دھو کر زباں سوں اپنی پہلے پیرسوں بیان پر
بولوں صفت خدا کی کر شکر میں زبان پر

شاہ میراں جی شمس العشاق رحمۃ اللہ علیہ (۹۰۳ھ)

شاہ میراں جی شمس العشاقؒ کا مولد مکہ معظمہ ہے۔ ہندوستان میں آکر بیجاپور میں قیام کیا۔ اپنے زمانے کے اولیائے کبار میں سے ہوئے ہیں۔ خواجہ کمال الدین بیابانی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ دکن کے مشہور و معروف بزرگ خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ آپ کے پڑ دادا پیر تھے کیونکہ شیخ کمال الدین بیابانیؒ، شیخ جمال الدین مغربیؒ کے خلیفہ تھے جن کی بیعت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ سے تھی۔ مولف اولیائے بیجاپور نے لکھا ہے[1] کہ مرزا نصیح الدین خاکسارؒ المعروف بہ بابا سبحنجل جو تصوف اور شعر کے میدان میں سرآمد روزگار تھے اور دکن کے امیر خسرو کہلاتے تھے حضرت شمس العشاقؒ ہی کے مرید اور خلیفہ تھے[2]۔ کہتے ہیں حضرت شمس العشاقؒ نے بارہ حج کیے تھے۔ علم و فضل میں بھی یگانہ روزگار تھے۔ تصوف کے موضوع پر انھوں نے چھوٹے بڑے کئی رسالے لکھے ہیں جن میں سے قابلِ ذکر شرح مرغوب القلوب، جل ترنگ اور گل باس ہیں۔ ان میں تصوف کے رموز بعض جگہ تمثیلی انداز میں بیان کیے ہیں[3]۔ زبان ان سب رسالوں کی دکنی ہے۔ اس اعتبار سے ملا وجہی کی سب رس کی حیثیت ثانوی رہ جاتی ہے۔ کیونکہ وہ ان رسائل کے بعد کی تصنیف ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ملا وجہی کی سب رس

---

[1]: اُردوئے قدیم از شمس اللہ قادری، ص ۱۰۸

[2]: اُردوئے قدیم از شمس اللہ قادری، ص ۱۰۸

[3]: اُردوئے قدیم از شمس اللہ قادری، ص ۱۰۸

کا انداز افسانوی ہے اور شاہ شمس العشاقؒ کے رسالوں کی صورت ایسی نہیں لیکن ان کی نثر کا اسلوب کہیں کہیں تمثیلیہ ضرور ہے[1]۔ انھوں نے بے جان چیزوں کو جاندار بنا کر یا مشخص کر کے ان کے ذریعے مسائل و مباحث کی تشریح و توضیح کا کام لیا ہے۔ حامد حسن قادری نے تو داستان تاریخ اُردو میں سب رس نام کے ایک نثری رسالے کو شاہ شمس العشاقؒ کی تصنیف بھی بتایا ہے[2] لیکن اس کا موضوع اور اس کی ہیئت ملا وجہی کی سب رس سے مختلف ہے۔

اس کی نثر کا نمونہ دیکھیے

"اوّل تجھے جو کوئی سکھلاتا ہے اس سے پوچھ۔ توں نہیں سکلایا (یعنی سکھلانا) سو تجھ پر کھلا ہے۔ اس کا کام اس پر نہیں کھُلیا سو تجھ پر کیا کھلے گا۔"

اس عبارت میں پنجابی صرف کے اثرات بھی ہیں۔ کھلنا مصدر کا فعل ماضی پنجابی میں کھلیا اور اُردو میں کھُلا ہے۔ اسی طرح تو کے لیے توں سکھلانے کے لیے سکلانا وغیرہ الفاظ آج بھی پنجاب میں مستعمل ہیں۔ حافظ محمود شیرانی نے پنجاب میں اُردو میں اسی لیے کہا ہے کہ دکنی میں ساٹھ فیصد الفاظ پنجابی کے ہیں اور سبب اس کا غالباً شمال سے جنوب کی طرف بڑے پیمانے پر لوگوں کی آمد و رفت اور آباد کاری ہے۔

رسالہ شرح مرغوب القلوب کی نثر کا نمونہ :

"خدا کہا تحقیق مال اور پنگرڑے (اولاد) تمہارے دشمن ہیں۔ چھوڑ دیو دشمنوں کوں۔ اے کیا غفلت ہے۔ جو تجھے اندھلا (اندھا) کیا موت کی یاد تھے (سے) تجھے بسرا کر (بھلا کر)"

اس عبارت میں دینا مصدر کا فعل امر "دیو" پنجابی صرف کے مطابق ہے اُردو میں

---

[1] اردوئے قدیم از شمس اللہ قادری، ص ۱۰۸

[2] داستان تاریخ اُردو از حامد حسن قادری، ص ۳۴

دو" ہونا چاہیئے۔

شاہ شمس العشاق کے سارے نثری رسالے تصوف و عرفان اور ہدایت و رشد کے موضوع پر ہیں۔ ان میں نماز، وضو، دنیا، تجرید، تفرید، عشق، شریعت وغیرہ کی تشریح صوفیانہ نقطہ نظر سے کی گئی ہے۔

نثر کے علاوہ شاہ میراں جی شمس العشاق کے رسالے دکنی نظم میں بھی ہیں۔ ان میں ایک کا نام شہادت الحقیقت (یا شہادت التحقیق) ہے[1] یہ ایک طویل نظم ہے لیکن سلیس اور سادہ زبان میں ہے۔ بحر بھی آسان اور رواں ہے۔ موضوع اس کا بھی عرفان اور ہدایت ہے۔ شروع میں حمد، نعت، منقبت اور مدح پیر کے عنوان سے شعر بھی ہیں سارا رسالہ سوال و جواب کے انداز میں ہے۔ مرید کی طرف سے کوئی سوال کیا جاتا ہے اور پیر اس کا جواب دیتا ہے۔

نمونہ حمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم + الرحیم تو سبحان
یہ سب عالم تیرا + رزّاق سبھوں کیرا

شاہ شمس العشاقؒ کا دوسرا منظوم رسالہ خوش نامہ کے نام سے ہے[2]۔ اس میں عورت سے خطاب اور نسوانی لوازمات و علامات کے ذریعے مسائل عرفان بیان کیے گئے ہیں۔ اس کا مرکزی کردار خوشش (یا خوشنود) نام کی ایک لڑکی ہے۔ جو دنیا سے نفرت اور خدا سے محبت کرتی ہے۔ اسے فنا فی المرشد دکھایا گیا ہے جو فنا فی اللہ تک پہنچنے کی پہلی اور ضروری منزل ہے اور اس طرح دنیا پر آخرت کو ترجیح دینے کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے۔ عہد حاضر کے بعض نقاد اس قسم کی بات دیکھ کر صوفیا پر ترک دنیا اور رہبانیت اختیاری کا الزام لگاتے ہیں، یہ لوگ اصل میں قرآن اور تصوف دونوں کی روح سے ناواقف ہوتے ہیں۔ قرآن میں بیسیوں مقامات پر دنیا کے بدلے آخرت اختیار کرنے

---

[1] : اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام، ص ۴۶

[2] : اردو شہ پارے از محی الدین قادری زور، ص ۲۶

اور دنیا کی برائی کی گئی ہے، کسی صوفی سے پہلے تو خالقِ کائنات کے ترک دنیا کی بات کرنی چاہیئے۔ معاملہ ترک دنیا کا وہ نہیں جو آج کے مغرب زدہ بے دین اور دنیادار نقاد سمجھتے ہیں بلکہ دو لفظوں میں یہ معاملہ صرف اتنا ہے کہ دنیا کو اس طرح بسر کرو کہ ہر بات، ہر معاملہ اور ہر قدم دین بن جائے۔ قرآن اور تصوف اس دنیا کو ترک کرنے کے لیے کہتے ہیں جو آخرت کو بھلا دیتی ہے۔ اللہ کے بندوں کی طرح اگر دنیا بسر کی جائے تو وہ دین ہو جاتا ہے۔ جہاں تک عبادت و ریاضت کے لیے گوشہ نشینی اختیار کرنے کی بات ہے تو وہ تو وہی بات ہے جیسے کہ کوئی، طالب علم امتحان میں اوّل آنے کے لیے یا اعلیٰ ریسرچ کے لیے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ایک طرف ہو جاتا ہے، چوبیس گھنٹوں میں سے کچھ گھنٹوں کے لیے اور پوری زندگی میں اس وقت تک کے لیے جب تک منزل مقصود ہاتھ نہیں آتی۔ منزل مقصود پانے کے بعد طالب علم ملازمت میں اور صوفی ہدایت و رشد کے بوریا پر بیٹھ کر خلق خدا کی رہنمائی اور بھلائی میں مصروف ہو جاتا ہے اسے تارک الدنیا نہیں کہیں گے نہ اسے ......

خوش نامہ میں تقریباً ایک سو ستّر[1] شعر ہیں۔ شاہ صاحب نے خود اپنے شعروں کو دوہے کہا ہے۔ نثری رسالوں کی بعض عبارتوں کی طرح تمثیلیہ انداز اس میں بھی نظر آتا ہے، جس میں مختلف اشیاء کو استعاروں اور علامات کی صورت میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس نظم کی بحر طویل اور دلکش ہے۔ اس قسم کا ان کا ایک اور رسالہ بھی ہے اس میں بھی خوش (یا خوشی) ایک نسوانی کردار ہے جو میراں جی شمس العشاقؒ سے مختلف سوال کرتی ہے جن کا جواب میراں جی دیتے ہیں۔ اس رسالے کا نام خوش نغز ہے[1]۔ یہ بھی نظم میں ہے اور خوش نامہ سے قدرے مختصر ہے۔ اس میں بہتر تہتر[2] کے قریب دوہے ہیں۔ اسے عرفان و روح، مراقبہ، عقل و عشق، کرامات، موحد و ملحد جیسے نو ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے اور سوال و جواب کی صورت میں ان کی عارفانہ توضیحات کی گئی ہیں۔ یہ کتاب غالباً گنجِ عرفان کے نام سے چھپ بھی چکی ہے۔ دونوں رسالوں میں نسوانی کردار

---

[1]: اردو شہ پارے از محی الدین قادری زور، ص ۲۶

کا ہونا اور ایک لڑکی کی طرف سے اپنے پیر و مرشد سے سوالات کرنا اور مختلف موضوعات سے واقفیت حاصل کرنا اس بات کی دلیل معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالے لڑکیوں کی عرفانی تعلیم و تربیت کے لیے لکھے گئے ہیں۔

مذکورہ بالا تصانیف میں سے شہادت الحقیقت ہمارے لیے اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں میراں جی نے خود دکنی زبان اختیار کرنے کی توجیہ کی ہے۔

ہیں عربی بول کیرے — اور فارسی بُہتیرے
یہ ہندی بولوں سب — اس ارتوں کے سبب
یہ بھاکا بھلسو بولی — پن اس کا بھاوت کھولی
یو گر مکہ پند پایا — تو ایسے بول چلایا

یہاں میراں جی نے دکنی زبان کو ہندی ہی کہا ہے جیسا کہ اس زمانے میں ہر مقامی زبان کو کہا جاتا تھا اور اشعار بھی ایسے ہیں جن میں میراں جیؒ نے ہندی اختیاری کی توضیح کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو عربی جانتے ہیں نہ فارسی۔ ان کے لیے یہ باتیں ہندی میں لکھی گئی ہیں۔ ظاہر پر نہ جانا چاہیئے۔ باطن کو دیکھنا چاہیئے۔ زبان کوئی بھی ہو معنوں پر خیال کرنا چاہیئے جیسے مٹی چھان کر سونا نکالتے ہیں اس طرح بات کے مغز کو لینا چاہیئے اور لفظوں کا خیال نہیں کرنا چاہیئے۔

یہ بھی مشہور ہے کہ میراں جی شمس العشاقؒ نے ہندی زبان کو ایک بشارت کے تحت اختیار کیا تھا[۱] جب وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ مبارک پر حاضری دینے مدینہ منورہ گئے تو تقریباً بارہ برس اس شہر میں رہے۔ ایک شب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ہندوستان کی طرف جانے کا اشارہ کیا تاکہ وہاں تبلیغ دین کی جائے۔ میراں جیؒ نے جواب دیا کہ میں وہاں کی زبان نہیں جانتا اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا تمہیں ساری زبان معلوم ہو جائے گی۔ یہ فیضان نبوی تھا کہ میراں جیؒ از خود اس زبان سے

---

[۱] : اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام از مولوی عبدالحق، ص ۴۵

واقف ہو گئے جس سے ان کی پہلے کوئی واقفیت نہیں تھی اور پھر واقفیت جب ہوئی تو صرف بولنے کی حد تک نہیں بلکہ تصنیف و تالیف کی حد تک ہوئی۔

شاہ برہان الدین جانم رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۹۹۰ھ تقریباً)

شاہ برہان الدین جانمؒ میراں جی شمس العشاقؒ کے فرزند اور خلیفہ تھے۔ علوم ظاہری بھی اپنے والد بزرگوار ہی سے حاصل کیے تھے۔ اپنے والد کی طرح وہ بھی کثیر التصانیف بزرگ ہیں۔ مولوی عبدالحق کہتے ہیں کہ میرے پاس ان کے کلام کا بہت بڑا مجموعہ ہے[1]، ان میں سوائے ایک کے سب رسالے منظوم ہیں جو تصوف و سلوک کے موضوعات پر ہیں ان کے کلام کا انداز بھی میراں جیؒ کی طرح کا ہے۔

ہندی زبان اختیار کرنے پر انھوں نے معذرت کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس کے اختیار کرنے میں کوئی خرابی نہیں۔ انھوں نے بھی اپنے والد بزرگوار کی طرح یہی لکھا ہے کہ الفاظ کی بجائے معنوں پر نظر رکھنی چاہیئے۔ وہ کہتے ہیں کہ عقل مندوں کو اگر سمندر کے موتی کسی جوہڑ میں نظر آئیں تو لے لینے چاہییں۔ زبان ہندی کو جوہڑ سمجھ لیں اور اس میں جو مضامین ہم نے پیدا کیے ہیں ان کو موتی۔ ان کے لیے لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اس ہندی اختیاری کا نتیجہ یہ ہوا کہ دین اور معرفت کی باتیں ان لوگوں تک بھی پہنچ گئیں جو عربی فارسی سے نابلد تھے اور ساتھ ساتھ ایک نئی زبان (جو اس وقت ہندی اور بعد میں اُردو کے نام سے منسوب ہوئی) کی ترویج و ترقی میں بھی مدد ملی۔

شاہ برہان الدینؒ جانم کے نثری رسالے کا نام بحر الحقائق ہے[2]۔ اس کی زبان دکنی اور مضامین عارفانہ ہیں۔ یہ بھی سوال و جواب کی طرز میں ہے۔ مثال کے طور پر سوال ہے

---

[1]: اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۵۶

[2]: داستان تاریخ اُردو از حامد حسن قادری، ص ۳۴ / ۳۵

یہ تن الادھا (علیحدہ) دستا کیلن جیتا بکار ٹوٹتے نہیں بلکہ سستر (قلب ماہیت) بکار روپ دستا ہے تکہ تل قرار نہیں جیوں مرکٹ (بندر) روپ — جواب ہے اے عارف ظاہر تن کے فعل سوں گزریا و باطن کرتب دستے اس کا ناتوں سوں ممکن الوجود —

سوال وجواب کا جو انداز میراں جی شمس العشاقؒ نے منظوم رسالوں میں اختیار کیا ہے یہاں وہی انداز نثر میں ملتا ہے۔ یہ مسائل و معاملات کی تفہیم کا بڑا عمدہ اور مؤثر انداز ہے۔

نصیر الدین ہاشمی نے دکن میں اُردو میں ان کے دو اور نثری رسالوں کا ذکر کیا ہے۔[1] ان میں سے ایک کا نام معرفت القلوب اور دوسرے کا نام ہشت مسائل ہے۔ ہشت مسائل کے نام سے ایک رسالہ خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کا بھی ہے۔ یہ مخطوطات آقا حیدر حسن کے پاس محفوظ کہے جاتے ہیں جو نظام کالج حیدرآباد (دکن) کے استاد ہیں۔ نصیر الدین ہاشمی نے اپنی کتاب دکن میں اردو میں ان کے نمونے دیے ہیں[2]

"بسم اللہ ناتوں اللہ کا الرحمٰن مہربان الرحیم بخشنہار اور بخشا نہارا۔ سرانا نواز نا خدا کوں بہوت کہ اوپر درش کرنہار تمام عالم کوں جان اے سالکاں پچھانت کرنا شریعت کا ہور طریقت کا ہور معرفت کا۔ اس میں بیان تمام ہے کہ نفع پانے کے بدل عالماں کوں ہور عاشقاں کوں ہور و اصلاں کوں اب تو سب کو تسلی دکھلاتا ہے۔"

شاہ برہان الدین جانمؒ کا زیادہ تر سرمایہ نظم میں ہے۔ وصیت الہادی، سکھ سہیلا، منفعت الایمان، نکتہ واحد، نسیم الکلام، رمز الواصلین، بشارۃ الذکر، حجت البقاء، بیان خلاصتہ اور ارشاد نامہ ان کے مستقل منظوم رسالے ہیں۔ محی الدین قادری زور نے

---

[1] : دکن میں اُردو از نصیر الدین ہاشمی، ص ۱۲۳ / ۱۲۶

[2] ، دکن میں اُردو، ص ۱۲۶

اپنی تالیف اُردو شہ پارے میں ان سب کا تعارف کرایا ہے۔ حقیقت کے عنوان سے ان کا جو منظوم کلام ہے وہ الگ ہے۔ انہوں نے غزلیں اور دوہے بھی لکھے ہیں۔

وصیت الہادی ایک مختصر مثنوی ہے جس کا موضوع تصوف ہے۔ سکھ سہیلا چھپن[۵۶] شعروں کا ایک ترکیب بند ہے جس میں ایک خاص مصرع ہر تین بند کے بعد دہرایا جاتا ہے اس اعتبار سے اسے ترجیع بند بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس میں مریدوں کو خدا کی وحدت کی تعلیم دی گئی ہے۔ منفعت الایمان تقریباً ایک سو بیس اشعار کی مثنوی ہے جس میں دہریوں کے اعتقادات بیان کیے گئے ہیں اور مریدوں کو ان سے پرہیز کرنے کی تلقین کی گئی ہے طرز بیان کے لحاظ سے یہ شاہ صاحب کا بہترین کارنامہ کہا جاتا ہے[۱]۔ نکتہ واحد کا موضوع خدا کی توحید ہے۔ اس میں دو نظمیں ہیں ایک بارہ[۱۲] اور دوسری انیس[۱۹] شعروں کی۔ نسیم الکلام میں پینتالیس اشعار ہیں جس میں بعض قرآنی آیات اور احادیث کی شرح ہے۔ رمز الواصلین بھی منظوم ہے اس میں تصوّف کے مضامین بیان کیے گئے ہیں۔ حجۃ البقاء میں پچاسی[۸۵] اشعار ہیں اس کا نفس مضمون خدا کی بزرگی اور وحدانیت ہے۔ مصنف نے اس مضمون کو ایک مرشد اور اس کے مرید کے مکالمے کی صورت میں بیان کیا ہے۔ انداز اس کا شاہ میراں جی شمس العشاقؒ کی سی نظموں کا سے۔ بیان خلاصہ کے متعلق یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ یہ شاہ برہان الدینؒ ہی کی تصنیف ہے، لیکن یہ اس دور کی تصنیف ضرور ہے اور عام طور پر اس کی نسبت شاہ برہان الدینؒ ہی سے کی جاتی ہے۔ ارشاد نامہ ان کی طویل ترین نظم ہے اس میں تقریباً دو سو پچاس اشعار ہیں یہ رشد وہدایت، پند و نصیحت اور تصوف وعرفان کی متفرق باتوں کا مجموعہ ہے۔ شاہ برہان الدین کی نظم کا نمونہ دیکھیے۔

عیب نراکھیں ہندی بول　　　معنی تو چک دیکھ ڈھنڈول
جو نکلے موتی سمندر سات　　　ڈا برجے لاگیں ہات

---

[۱]، اُردو شہ پارے　از محی الدین قادری زور، ص ۳۲

یکوں نہ لیوے اس بھی کوئے — سہانا جتر جے کوئی ہوئے
ہیں سمندر کے موتی لو — گیان رتن کے جوتی لو
ہندی بولوں کیا بکھان — جے گرُ پرساد تھا منج گیان

مولوی عبدالحق کہتے ہیں کہ علاوہ مثنویوں کے شاہ برہان الدین جانم نے بہت سے خیال اوردوہے بھی لکھے ہیں جن کی ایک اچھی خاصی تعداد میرے پاس موجود ہے پھر انھوں نے خیال کا یہ نمونہ دیا ہے :

اب سندلیسا مجھ ہے شہ کا — جب کب بھاگوں انتر ملے
پیر پیرم کے ہیڑے میرے — نینوں مانہہ جوں کنکر ملے
نس دن جاگے برہ ماری — نہ نیند او دیکھے نین پڑے
پلکیں میری اگ بلے کیوں — سپنے دیکھوں سوکھرے

شاہ برہان الدین جانم کی نظم و نثر کے مزید نمونوں کے لیے مولوی عبدالحق کی کتاب اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام (ص ۵۶ تا ص ۶۵) دیکھیے۔

سید شاہ زندہ حسین رحمۃ اللہ علیہ

حضرت سید شاہ زندہ حسینؒ حضرت شاہ راجو قتالؒ کے عم بزرگ سید اکبر حسینی کے خلیفہ تھے حالت جذب میں رہتے تھے ان کو "جھاڑو شاہ" بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ مستی کے عالم میں سڑکوں پر جھاڑو دیا کرتے تھے۔ان کا مزار شاہ علی بنڈہ میں ہے، سخاوت مرزا کے مقالہ شاہ راجو قتال گولکنڈوی میں ان کا بھی ذکر ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ آپ کی دکنی زبان کی تصانیف میں ایک سہاگن نامہ ہے جو عورتوں کے لیے

لہ : اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام ،ص ۵۸

پند ونصیحت کے موضوع پر ہے۔ اس سے پہلے خوش نامہ اور خوش نغز جیسی جن نظموں کا یہاں میراں جی شمس العشاقؒ کے سلسلے میں ذکر ہو چکا ہے، ان کا مقصود بھی یہی تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان بزرگوں نے مسلمان عورتوں اور لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کو بڑی اہمیت دی ہے اور دی بھی جانی چاہئے کیونکہ اگر عورت خصوصاً عورت بطور ماں کی صحیح تربیت ہو، تو اولاد کے خیالات و افکار اور کردار و اعمال پر بھی صحت مند اثر پڑے گا۔

سید شاہ زندہ حسینؒ کا تصوّف کے موضوع پر ایک نثری رسالہ بھی ہے۔ اس کا موضوع بھی عرفان و ہدایت ہی ہے۔ آپ نے اپنے مرشد کے ملفوظات بھی جمع کیے تھے جن کی آپ کے ایک مرید شاہ حسین نے تدوین کی ہے۔ سہاگن نامہ کتب خانہ سالار جنگ کے دکنی مخطوطات میں اور نثری رسالہ کتب خانہ روضہ گلبرگہ شریف میں موجود ہے۔ فارسی زبان میں بھی ان کا ایک منظوم رسالہ کیمیائے سعادت کے نام سے ہے۔ امام غزالیؒ کی بھی ایک کتاب اسی نام سے ہے لیکن یہ اس سے قطعی مختلف ہے۔

شاہ میراں جی خدا نما رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۰۷۰ھ)

شاہ میراں جی خدا نماؒ کا اصل نام سید میراں حسنی تھا[1]۔ عام طور پر انہیں میراں جی خدا نما یا میراں جی حسن خدا نماؒ کہتے تھے۔ حیدر آباد (دکن) وطن تھا۔ ابتداء میں سلطان عبد اللہ قطب شاہ کی ملازمت میں تھے پھر محبت الٰہی نے ایسا غلبہ پایا کہ بیجاپور پہنچے اور حضرت امین الدینؒ اعلیٰ کے مرید ہو گئے۔ یہ وہی امین الدین اعلیٰ ہیں جو حضرت برہان الدین جانم کے فرزند اور جانشین تھے اور اپنے والد کی طرح صاحب رشد و ہدایت اور صاحب تصنیف بھی تھے۔ ان دونوں بزرگوں نے دکنی زبان میں کئی رسالے لکھے ہیں۔ شاہ میراں جی خدا نماؒ نے بھی ان بزرگوں کی صحبت سے فیضان حاصل کیا ہے اور تصوّف و عرفان کے میدان میں وہ مقام اعلیٰ پایا ہے کہ

---

[1] داستان تاریخ اُردو، ص ۳۶- اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام، ص ۶۴/۶۵-

"خدا نما" کے لقب سے مشہور ہوئے ہیں۔

مرشد سے سرمایہ علمی اور فیض روحانی حاصل کرنے کے بعد شاہ میراں جیؒ خدا نما پھر حیدرآباد آ گئے اور یہیں بیٹھ کر خلقِ خدا کی بھلائی اور ہدایت کا کام کرتے رہے انھوں نے امام غزالیؒ کے بھائی شیخ احمدؒ کی تصنیف تمہیدات عین القضاۃ کا دکنی نثر میں ترجمہ کیا ہے۔ حامد حسن قادری نے داستانِ تاریخ اردو میں اسے عین القضاۃ ہمدانی کی تصنیف کہا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ شاہ میراں جی خدا نما نے اپنے ترجمے کا نام شرح تمہید ہمدانی رکھا ہے۔ سن کتابت اس پر ۱۰۶۷ھ درج ہے۔ عین القضاۃ بے شک شیخ ہمدانی ہی کی تصنیف ہے لیکن اس پر شرح تمہیدات کے نام سے شیخ احمد نے لکھی ہے۔ اس لیے اس کا نام تمہیدات عین القضات ہے۔ البتہ ترجمہ کا نام ہمدانی کی نسبت سے شرح تمہید ہمدانی ہے۔ اس کتاب کا موضوع تصوف و اخلاق ہے۔ دکنی ترجمہ نثر میں ہے اور صاف و رواں ہے۔ مولوی عبدالحق نے کہا ہے کہ اصل کتاب کے مصنف عبداللہ شاہ بن محمد المیاں جی ملقب بہ عین القضاۃ ہمدانی ہیں جو قوام الدین ابوالقاسم درگزینی وزیر سلطان سنجر کے حکم سے ۵۳۳ھ میں قتل کر دیے گئے تھے۔ ترجمہ شدہ کتاب کا نمونہ نثر یہ ہے :

"اے عزیزاں اے (یعنی یہ) بات نہیں سنیاں، بادشاہ گھوڑا مستعد کئے باج (بغیر یعنی) نہیں سوار ہوتے ہور گھوڑے میں کچھ کھوڑا اچھے (یعنی کچھ عیب ہو) تو بھی قبول نہیں کرتے یعنی پیر کے عشق میں پختہ ہوئے باج خدا کے عشق میں نہ آسکسی (یعنی نہیں آسکتا)۔

یہ عبارت میراں یعقوب کی شمائل الاتقیا اور سید عبداللہ حسنی کی نشاط العشق کی طرح جملہ دکنی زبان کی خصوصیات کی حامل ہے اور شمالی زبانوں کے اثر کا بھی صاف پتہ دیتی ہے۔

شاہ میراں جی خدا نماؒ سے ایک منظوم رسالہ چکی نامہ عرفان بھی یادگار ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے فہرست ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن میں اس کا ذکر کیا

ہے۔ لیکن سخاوت مرزا کے نزدیک اس کی میراں جی خدا نماؒ سے نسبت مشتبہ ہے۔ وہ کہتے ہیں یہ چکی نامہ حضرت سیّد ہاشم خداوند باری خدا نماؒ کی تصنیف ہے جو حضرت امین الدین اعلیٰؒ کے خلیفہ اور حضرت میراں جی خدا نماؒ کے پیر بھائی تھے۔[1]

چکی نامہ عرفان میں تصوف کے مضامین خصوصاً خدا کی یاد اور اس کی محبت کے موضوعات گیت کے انداز میں بیان کیے گئے ہیں ان کا مقصود بھی چکی پیستے وقت عورتوں کو خدا کی یاد میں مشغول رکھنا ہے۔ وہ چکی بھی پیستی رہیں اور یہ گیت بھی الاپتی رہیں۔ اس سے اللہ کا ذکر بھی ہوتا رہے گا اور کام سے تھکاوٹ بھی نہیں ہو گی۔ چکی نامہ کا عنوان دکنی دَور میں دوسرے شاعروں کے ہاں بھی مقبول رہا ہے۔ مذکورہ چکی نامہ ایک ترکیب بند ہے جس میں دو دو اور تین تین مصرعوں کے سولہ بند ہیں اور ہر بند کے آخر میں ایک ہی مصرع دہرایا گیا ہے اس لحاظ سے یہ ترجیع بند بھی ہو سکتا ہے۔ جنوبی ہند میں لکھے گئے دوسرے چکی ناموں میں چکی نامہ فاروقی، چکی نامہ سیّد محمد حسینیؒ چکی نامہ شاہ فی الحال قادریؒ اور رفاعی سلسلے کے شاعروں کے کچھ چکی نامے قابلِ ذکر ہیں۔ ان سب کا منشا و مقصود ایک ہی ہے، ہاتھ کام میں اور دل یاد میں ۔ چکی نامہ اور اس قسم کی دوسری اصناف مثلاً چرخہ نامہ، پنکھی نامہ، ڈھول نامہ وغیرہ صوفیوں اور صوفی منش شاعروں نے چکی، چرخہ، پنکھی اور ڈھول میں مصروف رہنے کے ساتھ ساتھ ذکرِ خدا سے غافل نہ رہنے کے لیے لکھی ہیں، لیکن بعد میں ان کا رواج مفقود ہو گیا دکنی کی طرح پنجابی میں بھی ان اصناف کا کافی رواج رہا ہے۔

شاہ امین الدین اعلیٰ رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۰۸۶ ھ)

شاہ امین الدین اعلیٰ شاہ میراں جی شمس العشاقؒ کے پوتے اور حضرت برہان الدین جانمؒ کے فرزند تھے۔ اپنے باپ دادا کی طرح وہ بھی علمائے عظام اور اولیائے کبار

[1] : رسالہ سب رس، مئی ۱۹۴۳ء، ص ۶۴

میں سے ہوئے ہیں انھوں نے زیادہ تر سلطان عادل شاہ کا زمانہ دیکھا ہے۔ مزار ان کا بیجاپور میں ہے۔

شاہ امین الدین اعلیٰؒ نے دکنی زبان میں کئی نظمیں اور رسالے تصنیف کیے ہیں۔ جواہر اسرار اللہ کے نام سے ان کے مریدوں نے ان کا بہت سا کلام جمع کیا ہے جو زیادہ تر مثنویوں اور دوہوں کی شکل میں ہے۔ قصائد کی ہیئت میں بھی ان کی شاعری ملتی ہے ان میں سے ایک کا نام محب نامہ یا محبت نامہ ہے۔ یہ کسی امیر یا بادشاہ کے لیے نہیں ہیں بلکہ عرفانی رنگ کے ہیں۔ نظموں میں وجود نامہ اور رموز السالکین قابل ذکر ہیں۔ ان کے نثری رسالوں میں سے بعض انجمن ترقی اُردو اور جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے کتب خانوں میں موجود ہیں[1]۔ نامہ کے لاحقہ سے انہوں نے اپنی کئی نظموں اور رسائل کے نام تخلیق کیے ہیں۔ ذکر نامہ، نور نامہ، وصیت نامہ، وصل نامہ، محبت نامہ، وجود نامہ وغیرہ اسی قبیل کی تصانیف ہیں۔ شاہ امین الدین اعلیٰؒ کی ایک آدھ غزل قدیم ریختہ یعنی فارسی اور ہندی کے ملے جلے انداز میں بھی ملتی ہے[2]۔ ان کے زیادہ تر کلام میں وحدۃ الوجود کا رنگ جھلکتا ہے اور اس کے لیے انہوں نے صنعت اقتباس کو خاص طور پر استعمال کیا ہے۔ یعنی قرآنی آیات اور احادیث کو کُلّی یا جزوی طور پر اپنے شعروں کا حصہ بنایا ہے۔ مثال کے طور پر یہ شعر دیکھیے۔

بہیو کوں بوجھا میں ہو فانی   پیا دستا "وجہہ اللہ" کے مانی
بہیو مُحِیطِ کُلِّ شَیْءٍ سمانی
وَفِیۡ اَنۡفُسِکُمۡ او کہاوے   نَحۡنُ اَقۡرَبُ نزدیک پاوے
دہی یاد جی اپسیں گنوا دی

شاہ امین الدین اعلیٰ کے نثری رسالے گفتارِ شاہ امین اور گنج مخفی کے نام سے

---

[1] دکن میں اُردو از نصیر الدین ہاشمی، ص ۱۶۲

[2] اردوئے قدیم از شمس اللہ قادری، ص ۱۳۳

بھی ہیں۔ ان کے مخطوطے بھی جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن اور انجمن ترقی اُردو ہند کے کتب خانوں میں موجود ہیں[1]۔ ان کا موضوع بھی تصوّف ہے اور بعض جگہ تمثیلیہ انداز بھی اختیار کیا گیا ہے۔

نمونہ نثر گنج مخفی

" اللہ تعالیٰ گنج مخفی کو عیاں کرنا چاہا تو اوّل اس میں سوں ایک نظر نکلی تو اس سے امین دیکھ ہوا۔ امین شاہد کوں کہتے ہیں یو دونوں ذات کے دو طور ہیں۔ ذات نے اپس کو دیکھا اسے نظر کہتے ہیں۔ دیکھ کر گواہی دیا تو اسے شاہد کہتے ہیں یہ تینوں مرتبے ذات کے ہیں۔"

اس عبارت میں نظر وغیرہ اسی قسم کے مشخّص کردار ہیں جس طرح وجہی کی سب رس میں ہیں۔ موضوع اس رسالے کا بھی توحید وجودی ہے اور اس میں ذات وصفات کے مختلف مراتب کا بیان ہے ایک حدیث قدسی ہے جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں ایک مخفی خزانہ تھا میں نے چاہا کہ میں اپنا آپ دکھاؤں میں نے یہ کائنات تخلیق کر دی۔ اس رسالے کی ابتدا اسی حدیث قدسی سے ہوتی ہے اور اس میں سب سے اوّل تخلیق نور محمدیؐ کا ذکر ہے، خالق نظر اور نور محمدی شاہد ہے۔ دونوں ایک عرصہ ایک دوسرے کے تماشائی رہے اور پھر اسی نور سے ساری کائنات تخلیق کی گئی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی لیے کہا ہے کہ میں اس وقت بھی تھا جب نہ زمین تھی نہ آسمان، نہ لوح تھی نہ قلم، نہ فرشتہ تھا نہ آدم یعنی کائنات اور اس کی کوئی شے بھی نہ تھی۔ پھر یہی نور پشت آدم علیہ السلام میں رکھا گیا وہاں سے پاک اور موحد صلبوں سے ہوتا ہوا بطن آمنہ سے بشریت محمدیؐ کے پیکر میں ظاہر ہوا۔

شاہ صدر الدین رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۸۷۶ھ)

شاہ صدر الدینؒ بہمنی دور کے شاعر اور درویش تھے۔ اپنے زمانے کے مشہور

---

[1] دکن میں اُردو از نصیر الدین ہاشمی (انڈیا ایڈیشن)، ص ۴۲

بزرگ حضرت بدرالدین چشتیؒ کے خلیفہ تھے۔ پہلے ناسک میں قیام تھا پھر پیپیری آ گئے۔ ان کا مزار یہیں ہے۔ شاہ صدرالدینؒ بھی صاحب تصنیف بزرگ تھے۔ انہوں نے کسب محویت کے نام سے ایک کتاب ۸۰۶ھ میں مکمل کی تھی۔ اس کا ایک مخطوطہ کتب خانہ ادارہ ادبیات حیدرآباد (دکن) میں موجود ہے[۱]۔ نصیرالدین ہاشمی نے دکن میں اُردو میں لکھا ہے کہ کسب محویت کے علاوہ شاہ صدرالدینؒ کی اور تصانیف بھی ہیں ان میں سے ایک کا نام رسالہ رموز الکاسبین ہے۔ یہ بھی عرفان و سلوک کے موضوع پر ہے۔ یہ رسالہ ہمارے لیے اس بنا پر بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ اس رسالہ میں شاہ صاحب نے الفاظ و معانی کے تعلق کی بحث چھیڑی ہے اور معانی کو الفاظ پر ترجیح دی ہے، اور اس میں دوسرے دکنی بزرگوں کی طرح یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ زبان چاہے کچھ ہو مطلب کی ادائیگی سے غرض ہونی چاہیئے۔ اس لیے ہندی اختیاری اور فارسی ترکی سے کوئی فرق نہیں پڑتا[۲]۔

مطلب سوں اپنے کام ہے کنی اچھوں یا فارسی
مکہ دیکھنے سوں ہے غرض جس جنس کی ہو آرسی

اس اصول کے تحت انہوں نے دکنی کو عربی اور فارسی پر ترجیح دی ہے جو اس وقت عوام تک ابلاغ دین کا بہترین ذریعہ تھا۔ کیونکہ مقامی آبادی کی اکثریت دکنی آشنا تھی عربی فارسی سے نابلد تھی[۳]۔ جنوبی ہند میں دکنی اور گوجری کے بہت بڑے سرمائے کی موجودگی اسی نظریے کی پشت پناہی کی بنا پر ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان بزرگوں نے فارسی عربی کو مذموم و مطعون گردانا ہے۔ بات صرف عوام تک ابلاغ کی ہو رہی ہے جہاں پڑھے لکھے لوگوں سے خطاب کی بات تھی انہوں نے فارسی کو بھی اختیار کیا ہے اور اس کو مسلمانوں کی ثقافتی زبان کے اعتبار سے سربلند رکھا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں

---

[۱]: دکنی کلچر از نصیرالدین ہاشمی، ص ۵۷

[۲]: دکن میں اردو از نصیرالدین ہاشمی (انڈیا ایڈیشن)، ص ۴۲

[۳]: دکنی کلچر از نصیرالدین ہاشمی، ص ۵۷

کرنا چاہیئے کہ ہمیں اپنی مذہبی، ثقافتی اور قومی زبانوں کو علاقائی اور محدود طبقہ کی بولیوں ٹھولیوں پر قربان کر دینا چاہیئے۔ بلکہ پیش نظر یہ رہنا چاہیئے کہ جس زبان میں بھی لوگ دین اور معرفت، نصیحت اور ہدایت کی بات سمجھتے ہیں، ان کے لیے وہی زبان اختیار کرنی چاہیئے۔ اگر وہ علاقائی زبان کی بجائے قومی اور مرکزی زبان کو سمجھتے ہوں تو پھر اسی کو اختیار کرنا چاہیئے۔ اردو زبان کو یہی فضیلت حاصل ہے کہ یہ برصغیر کے شمال جنوب، مشرق مغرب ہر جگہ سمجھی اور بولی جاتی ہے کہیں رواں اور کہیں ٹھمک کر۔ یہ برصغیر کی کاروانی زبان ہے اور کسی خطے کی مادری زبان نہ ہونے کے باوجود بھی یہ اس خطے کی زبان ہے۔ اسی لیے قدیم تذکرہ نگاروں اور مؤرخوں نے ہر خطہ کی زبان کو ہندی یا ہندوی کہا ہے دکنی، گوجری، پنجابی، بھاندی، سرائیکی، ملتانی، دہلوی، بنگالی، بہاری، کھڑی بولی، ہریانوی، کشمیری، بروہی، بلوچی، تامل، دراوڑی، کنڑی، بنگارو، راجستھانی، برج بھاشا، مگدھی، اردو مگدھی غرض کہ برصغیر کے کسی علاقے کی بولی یا زبان کا نام لیں وہ اردو کے وسیع سمندر میں مدغم ہے قدیم دور میں بھی اور اب بھی۔ اس لیے یہ کہنا کہ اردو اس علاقے کی زبان ہے اور اس علاقے کی نہیں محض ایک ضد اور جہالت ہے یہ ہر علاقے کی زبان ہے، یہ برصغیر کی "پدری زبان" ہے "مادری زبان" کچھ ہو، اس کو ہر کوئی سمجھتا بوجھتا اور بولتا چالتا ہے۔ یہ برصغیر کے مختلف مذہبوں، نسلوں، رنگوں اور زبانوں کے لوگوں کے لیے مقام اتصال، منزل اتحاد جنتِ دوستی اور فردوسِ امن کا مقام رہی ہے۔ ہمارے صوفیائے چشت نے عوام کے لیے اسی لیے اسے اختیار کیا ہے اور ہر صوبہ اور ہر علاقہ کے لوگوں کی اسی بنا پر ان کے پیغام تک رسائی رہی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو صوفیا اور ان کا پیغام دونوں محدود اور علاقائی ہو جاتے۔ یہ تصوف اور اردو ہی کی برکت ہے چاہے وہ کسی شکل میں ہے کہ سرحد کے خوشحال خان، سندھ کے شہباز قلندرؒ اور سچل سرمست، پنجاب کے داتا صاحبؒ اور باوا صاحبؒ، راجستھان کے خواجہ غریب نواز اجمیریؒ، دہلی کے قطب الدینؒ اور نظام الدینؒ، ہانسی کے جمال ہانسویؒ، پانی پت کے بو علی قلندرؒ، بہار کے شرف الدین یحییٰ منیریؒ، بنگال کے علاالحقؒ، دکن کے خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ، ملتان کے بہاالدین زکریاؒ اور دوسرے علاقوں کے بزرگ ایک تسبیح کے دانوں کی طرح ہیں۔ ان کا پیغام مختلف رنگوں کے

باوجود یک رنگ ہے۔ ان کے معتقدوں، مریدوں اور ماننے والوں میں محبت اور یگانگت ہے، چاہے وہ کہیں کے کیوں نہ ہوں اور ان کی زبان چاہے کسی علاقے کی کیوں نہ ہو لفظی، معنوی اور اسلوبی اعتبار سے اردو مرکزیت پر قائم ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں کو مختلف اللسان اور مختلف المقام ہونے کے باوجود صدیوں جس سبب نے ایک لڑی میں پرو دئے رکھا ہے وہ یہی صوفیا اختیاری تھی۔ ایک علاقے کا صوفی ہر علاقے کا صوفی ہے بخلاف جدید دور کے غلط سیاسی رجحانات کے جس نے رہنماؤں کو علاقائی اور مقامی بنا دیا ہے۔ آج بھی برصغیر کے ایک علاقے کا رہنے والا دوسرے علاقے کے سیاسی رہنما اور زبان کو تو نہیں مانتا لیکن صوفی اور اس کی زبان کو مانتا ہے۔ مانتا ہی نہیں اپنے عقیدے کا جزو خیال کرتا ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں میں یہ وجہ اتحاد و یگانگت صوفیا خصوصاً صوفیائے چشت کی وجہ سے آج سے تیس چالیس سال پہلے تک قائم رہی ہے جسے بعد میں سیاسی مصلحتوں، ذاتی اغراض اور مسلک تصوّف کی مخالفت نے پارہ پارہ کر دیا۔ سچ کہا ہے علامہ اقبال نے "وائے بر قومے کہ شاہے زاد و درویشے نہ زاد"۔ شاہ صدرالدین کی کتاب کسب محویت جس کا ذکر شروع میں ہو چکا ہے، ایک مخطوط ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد (دکن) میں موجود ہے۔ محی الدین قادری زور نے مخطوطات ادارہ ہذا کی فہرست میں اس کا ذکر کیا ہے[1]۔ سخاوت مرزا نے کہا ہے کہ اس کتاب ہی کا دوسرا نام رموز الکاسبین ہے[2] جس کا ایک نسخہ عمر یافعی کے کتب خانہ میں ہے لیکن یہ اس لیے صحیح معلوم نہیں ہوتا کہ محی الدین قادری زور نے ان دو کتابوں کے جو نمونے دیے ہیں وہ مختلف ہیں۔ ان کی بحریں بھی الگ ہیں اور الفاظ و معانی بھی۔ البتہ رموز الکاسبین، کسب عروج کا دوسرا نام ہو سکتا ہے جس کا ذکر

---

[1] : فہرست اُردو مخطوطات، ادارہ ادبیات اردو، حیدر آباد دکن، ص ۱۵۲

[2] : مقالہ، فہرست اردو مخطوطات پر ایک سرسری نظر از سخاوت مرزا رسالہ ہندوستانی ادب، جنوری ۱۹۴۶ء، ص ۲۹

ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے ادارہ ادبیات حیدر آباد کے مخطوطات کی فہرست میں کیا ہے۔ یہ تصوّف کے موضوع پر ہے اور اس میں روح، احدیت، وحدیت وغیرہ کا بیان ہے۔

سخاوت مرزا نے علم کیمیا کے موضوع پر شاہ صدرالدینؒ کے ایک رسالے کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے نواب دلاور خان کی فرمائش پر لکھا تھا۔ مؤلفؔ "میسور میں اردو" نے ایک شاہ محمد صدرالدین ولد شاہ میراں متوطن نلونگل کا ذکر کرتے ہوئے ان کی تصانیف من لگن، مرأۃ الاذکار، مصباح النور وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ یہ بزرگ سلطان حیدر علی کے زمانے میں ہوئے ہیں اور کسب عروج کے مصنّف شاہ صدرالدینؒ سے الگ ہیں۔ دونوں کے جنوبی ہند سے تعلق کی بنا پر ان میں اختلاط کا جو امکان ہے اس کو ختم کرنے کے لیے یہاں دوسرے بزرگ کا بھی ذکر کر دیا ہے۔

باباشاہ حسینی المعروف بہ پیر بادشاہ رحمتہ اللہ علیہ

باباشاہ حسینیؒ جو پیر بادشاہ کے لقب سے مشہور تھے، شاہ علی جیوؒ کے مرید معلوم ہوتے ہیں۔ یہ اشارہ ان کے اس شعر سے ملتا ہے۔

شاہ علی جیو جگ پرور تم ہو میرے لال
نازک نہال ہے شاہ حسینی را کھو تم سنبھال

مولوی عبدالحق نے اپنی کتاب اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام بس ان کے اشعار کا نمونہ دیا ہے اور لکھا ہے کہ ان کا کلام صوفیانہ اور عارفانہ طرز کا ہے[1]۔

اس صاحب ثنا سوں دیکھو جب صدا ہوا
ہر عبد تھی جواب سوں قالو بلیٰ ہوا
رو بر و ہے شہر درسن بے نقاب
دیک ناسک بولتے ہیں در حجاب

یہ ان کی غزل کا ایک مطلع ہے۔

---

[1] : اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام، ص ۷۵

سیّد شاہ راجو قتال رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۰۹۳ھ)

سیّد شاہ راجو قتالؒ مشہور چشتیہ بزرگ خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کی اولاد میں سے ہیں۔ وہ بہت بڑے بزرگ تھے اور شاعری سے بھی رغبت رکھتے تھے۔ ارادت ان کی سیّد اکبر حسینیؒ سے تھی[۱]۔ گولکنڈہ کا آخری بادشاہ تانا شاہ ان کا مرید اور معتقد تھا۔ سیّد راجو قتالؒ نے تحفۃ النصائح کے نام سے دکنی زبان میں ایک مثنوی لکھی ہے[۲]۔ اس نام کی ایک اور مثنوی بھی دکنی دور میں ملتی ہے۔ اس کے مصنف قطبی ہیں[۳]۔ سیّد شاہ راجو قتالؒ اور ان کے مرشد سیّد اکبر حسینیؒ کا فارسی کلام بھی ہے[۴]۔ تحفۃ النصائح کی زبان اس دور کے عام صوفی مصنفوں کی زبان ہے اور اس کا موضوع بھی وہی ہے جو عام طور پر صوفیانہ شاعری کا ہوتا ہے۔ تبلیغ و تلقین اور رشد و ہدایت کے ساتھ ساتھ عرفان و سلوک کی باتیں۔

شاہ من عرف رحمۃ اللہ علیہ

شاہ من عرفؒ دکن کے ایک صوفی شاعر تھے اور شاہ امین الدینؒ اعلیٰ کے مرید تھے۔ نصیر الدین ہاشمی نے کتاب دکن میں اُردو میں ان کی شاعری کا ذکر کیا ہے[۵] اور نمونہ کلام بھی دیا ہے جو تین تین چار چار بند لیے ہوئے نظم کی صورت میں ہے۔

---

[۱]: دکن میں اُردو از نصیر الدین ہاشمی، ص ۱۲۵

[۲]: اردو شہ پارے از محی الدین قادری زور، ص ۱۰۶

[۳]: اردوئے قدیم از شمس اللہ قادری، ص ۶۷

[۴]: مقالہ کلام حضرت شاہ راجو قتال گولکنڈوی از سخاوت مرزا

[۵]: دکن میں اُردو از نصیر الدین ہاشمی، ص ۲۱۰ / ۲۱۱

بوجھنا مشکل پڑیا بوجھنا پیو کا
وہ صاحب ہے سب جیو کا

واجب . ممکن ہے یو ہنکارا
ممتنع عارف ودیلو مکارا
روح شاہد ہے وہ پرکارا

شاہد مشہود کرنوں ایک انکارا
نور ترنجن ہے دو بے کارا
گنجِ مخفی سوں ہے اس کا اظہارا

جمال جلال کر توں ایک ٹھارا
نور جلال کنج سوں ہے تیارا
اس کے آنکھے دیکھو پیو کا دیدارا

شاہ من عرف عاجز بندہ گنہگارا
مرشد امین اعلیٰ گناہ بخشن ہارا
پیر بادشاہ اتارے مجھے پیلی پارا

شاہ میراں یعقوب رحمۃ اللہ علیہ

میراں یعقوبؒ بھی جنوبی ہند کے ایک درویش شاعر تھے۔ وہ شیخ برہان الدین غریبؒ کے خلیفہ تھے۔ شیخ برہانؒ نے تصوف کے موضوع پر فارسی زبان میں ایک

کتاب شمائل الاتقیاء کے نام سے لکھی تھی۔ میراں یعقوبؒ نے اپنے مرشد کی اس کتاب کا اسی نام سے دکنی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ فارسی کتاب اور دکنی ترجمہ دونوں نثر میں ہیں۔ کتاب بڑی ضخیم ہے اور اس میں تفسیر کی پندرہ، فقہ کی نو، اور دوسری کئی دینی کتب کے ماخذات سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ان کتابوں کی تعداد سو کے لگ بھگ بلکہ اس سے اوپر ہے، ساری کتاب چار قسموں اور نوے ابواب پر تقسیم ہے۔ توبہ، عمل حمیدہ، ہدایت و رشد، معجزہ و کرامت، حکمت بیعت، در حکم مرید، آداب مرید، حکم نماز، علمائے نیک، استقامت وغیرہ اس کے بیسیوں میں سے چند موضوعات ہیں۔ اس کی زبان دکنی ہے اور قدرے صاف اور رواں ہے۔ غیر مانوس الفاظ جو عام طور پر دکنی زبان میں دیکھنے میں آتے ہیں اس میں کم ہیں۔ نمونہ دیکھیے۔[1]

"اپنی حیات کے وقت منجے (مجھے) اشارت کیے تھے جوں شمائل الاتقیاء کتاب کوں ہندی زبان میں لیاوے تا ہر کسی کو سمجھاوے اس وقت منجے بیا نہیں تاکہ ایک ہزار ستر اوپر اٹھوں سال کو رحلت کئے۔"

اس مختصر سے اقتباس سے تین باتوں کا علم ہوتا ہے ایک تو یہ کہ شاہ برہان الدین غریبؒ ۱۰۷۸ھ کو فوت ہوئے تھے۔ دوسرے یہ کہ شمائل الاتقیاء کا ترجمہ شاہ میراں یعقوبؒ نے اپنے مرشد کی وفات کے بعد کیا ہے۔ اور تیسرے یہ کہ اس وقت کے قاعدے کے مطابق دکنی زبان کو بھی ہندی ہی کہا گیا ہے جس سے اس بات کی مزید تصدیق ہوتی ہے کہ قدیم علماء برصغیر کے ہر علاقے کی زبان کو ہندی/ ہندوی کہہ دیتے تھے۔

شاہ حسینی حسنی رحمۃ اللہ علیہ

شاہ حسینی حسنیؒ حضرت امین الدین اعلیٰؒ کے خلیفہ تھے۔ یہ سید میراں حسینی شاہؒ سے الگ بزرگ ہیں۔ جو شرح تمہید ہمدانی کے مصنف ہیں۔ وہ بھی حضرت امین الدین اعلیٰ

---

[1] : دکن میں اُردو از نصیر الدین ہاشمی، ص ۱۲۳

کے خلیفہ تھے اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کے زمانے میں ہوئے ہیں۔ نصیرالدین ہاشمی کی کتاب دکن میں اردو سے پتہ چلتا ہے کہ وہ غزل گو شاعر تھے اور ان کا تخلص حسینی تھا۔ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد (دکن) میں ان کا ایک مختصر دیوان موجود ہے۔ ایک غزل کے چند اشعار دیکھیے۔

ہوا تھا شوق مجھ کوں طبع تیرے آزمانے کا
نہیں ثانی ترا جگ میں توں نادر ہے زمانے کا
جہاں کے عاقل و دانا ہیں عاجز تجہ فراست سوں
کسے طاقت صنم تحسیں میں تیرے بار پانے کا

یہ شعر بھی دیکھیے:

حسینی حشر کا کچھ خوف مت کر
امین الدین ہے تیرا مددگار

ان اشعار کی زبان عام دکنی زبان سے کافی صاف اور رواں ہے۔ اس میں فارسی الفاظ بھی دوسری دکنی شاعری سے نسبتاً زیادہ ہیں اور یہ شمالی ہند کی زبان اردو معلیٰ سے قریب تر معلوم ہوتی ہے۔

شیخ احمد کھٹو رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۸۴۹ھ)

شیخ احمد کھٹو رح علاقہ گجرات (بھارت) کے بہت بڑے چشتی صوفی تھے۔[1] ان کے آباؤ اجداد دلیؔ کے رہنے والے تھے۔ شیخ کا اپنا بچپن بھی دلیؔ ہی میں گزرا ہے لیکن ان کی بعد کی پرورش اجمیر کے قریب کھٹو نامی ایک گاؤں میں ہوئی ہے اسی لیے آپ کے نام کے آگے لفظ کھٹو کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ اس گاؤں میں ایک بزرگ بابا اسحاق

---

[1] اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار از شیخ عبدالحق محدث دہلوی (اردو ترجمہ)، ص ۲۸۰

مغربیؒ تھے۔ شیخ احمد کھٹوؒ کی ابتدائی تربیت ان کے سائے میں ہوئی۔ انھوں نے فیض روحانی اور خرقہ خلافت بھی انہی سے پایا ہے۔ مرشد کی وفات کے بعد شیخ احمد کھٹوؒ دوبارہ دلی آگئے اور یہاں مزید تعلیم حاصل کرنے میں مشغول ہوگئے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مسجد خان جہاں میں بیٹھ کر خوب ریاضت و مجاہدہ کیا اور یہاں سے بادشاہ مظفر کے زمانے میں گجرات آگئے[1] اور اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنا وطن بنالیا۔ ان کا مزار اسی علاقے کے ایک قصبہ سرکھیج (نزدیک احمد آباد) میں ہے۔ سکندر ابن محمد عرف منجھو ابن اکبر نے کتاب مرآۃ سکندری میں ان کے نام کے ساتھ گنج بخش کے لقب کا بھی اضافہ کیا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ عوام میں اس نام سے مشہور تھے[2]۔

شیخ احمد کھٹوؒ کے ایک مرید محمود بن سعید ایرچی نے آپ کے ملفوظات تحفۃ المجالس کے نام سے جمع کیے ہیں۔ اس میں لکھا ہے کہ شیخ جب مسجد خان جہان میں تھے تو ایک تاجر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا جس نے کہا کہ میں شیخ نور الحق پنڈویؒ فرزند و خلیفہ شیخ علاؤ الدین علاؤ الحق پنڈویؒ کا مرید ہوں، میں نے ایک موقع پر جب اپنے شیخ کی خدمت میں حاضری دی تو انھوں نے پوچھا دلّی میں تم نے کس کس شیخ کی زیارت کی ہے، میں نے کئی شیوخ کے نام لیے، اس پر شیخ نور الحق پنڈویؒ نے فرمایا کہ اگر تم دلّی میں شیخ احمد کھٹوؒ سے نہیں ملے تو عمر برباد کی۔ میں اسی حکم کے تحت قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ شیخ نور الحق پنڈویؒ چشتیہ بزرگ تھے اس واقعہ سے ان کے نزدیک شیخ احمد کھٹوؒ کے مرتبہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

شیخ احمد کھٹوؒ کے ملفوظات کا ایک اور مجموعہ بھی ہے جسے ان کے مرید مولانا قاسم نے "مرقاۃ الوصول الی اللہ والرسول" کے نام سے جمع کیا ہے۔ ان ملفوظات میں شیخ احمد کھٹوؒ کے گوجری زبان میں کچھ اشعار بھی ملتے ہیں جن میں انھوں نے کھٹو تخلص استعمال کیا[3]

---

[1]: اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام، از مولوی عبد الحق، ص ۲۵ - ۲۶

[2]: مرآۃ سکندری، ص ۲۳۰

[3]: دیکھیے اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام از مولوی عبد الحق، ص ۲۵ - ۲۶

ہے۔ ایک دفعہ ایک شخص نے جب یہ دوہہ پڑھا

تُوں جانتا کرتار جی منجھ ساجن بیپرہ
سائیں سریسی سار کروں تمہاری بالیہا

تو شیخ احمد کھٹو رح نے فرمایا:

تُوں جانتا کرتار جی منجھ سائیں بیپرہ
سائیں ہی کی سار منجھ مانہ جو من بسنہ

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ان کی ایک کنیز آنکھوں میں سرمہ ڈالے ان کے سامنے آگئی۔
اس پر آپ نے غصّے میں کہا:

دوکھا کاجل جی کروں تو سوکن دکھ دنیہ
نہ پیو دیکھسن دنیہ مجھ نہ آپ دیکھ سکینہ

ایک دفعہ کسی کے اس مصرع پر دوہا کہا تھا:

بھولی بوجھوں بندتا دوران کسی ماس

دوہہ یہ ہے:

دیتی بجھتیں ایک پل جانوں برس پچاس
جی کن دیکھ دیس کی برسنہ انت نہ ماس

ان دوہوں سے دو باتوں کا پتہ چلتا ہے ایک تو یہ شیخ احمد کھٹو رح ہندی زبان سے بخوبی واقف تھے اور دوسرے یہ کہ ان کو دوہے کہنے پر اتنا عبور تھا کہ جب چاہیں کہہ سکتے تھے۔

حضرت قطب عالم رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۸۵۷ھ)

سید برہان الدین رح نام، قطب عالم لقب، سید ناصر الدین رح کے فرزند تھے۔ ان کے دادا سید جلال الدین بخاری رح المقلب بہ جہانیاں جہاں گشت رح اوچ شریف (بہاول پور) کے بہت بڑے عالم اور بزرگ تھے۔ جنھوں نے تحصیل علوم اور حصول فیضان

روحانی کے لیے بڑے دور و دراز کے سفر کیے تھے اسی لیے وہ جہانیاں جہاں گشت کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے[1] وہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلویؒ کے خلیفہ تھے۔

حضرت قطب عالمؒ کے والد بچپن ہی میں فوت ہو گئے تھے اس لیے ان کی پرورش سید مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے بھائی سید راجو قتالؒ نے کی تھی۔ سید راجو بھی اپنے بھائی کی طرح بہت بڑے عالم اور بزرگ ہوئے ہیں[2] ایسے بزرگ کی تربیت روحانی فیضان نظر اور صحبت سے حضرت قطب عالمؒ نے جو فیضان پایا اور جو مقام حاصل کیا ہو گا وہ ظاہر ہے۔

سید راجو قتالؒ کی تبلیغی سرگرمیوں کا مرکز اور دائرہ زیادہ تر علاقہ گجرات (بھارت) ہی رہا ہے[3] یہاں پتن نام کا ایک قصبہ تھا جو کسی وقت ہندو راجاؤں کا دارالحکومت تھا۔ سید راجوؒ اس مرکز کفر کی تاریکیاں نور میں بدلنا چاہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنے مختلف خلفاء کو بھی اس علاقے میں کام کرنے پر مامور کیا تھا۔ ان خلفاء میں سے سید محمد خدا بخشؒ اور سید احمد مخدوم جہانیاں شاہؒ کے مزارات اسی قصبے میں ہیں[4]

حضرت قطب عالمؒ کو بھی سید راجو نے اسی مشن پر بھیجا تھا۔ جہاں وہ اپنی والدہ کے ساتھ تشریف لے گئے تھے۔ پتن پہنچنے کے بعد انھوں نے تبلیغ دین اور اصلاح احوال امت کے لیے بڑا کام کیا۔ سلطان احمد والی گجرات کو ان سے بڑی عقیدت ہو گئی تھی۔ جب اس نے احمد آباد کا شہر آباد کیا تو حضرت قطبؒ عالم بھی وہاں چلے گئے۔ بعد میں وہاں سے موضع بٹوہ منتقل ہو گئے، جہاں انہوں نے ۸۵۷ھ

---

[1] : تذکرہ مخدوم جہانیاں جہاں گشت، از سخاوت مرزا، ص ۱۲

[2] : اخبار الاخیار از شیخ عبدالحق محدث دہلوی (ذکر راجو قتالؒ)

[3] : اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار (ذکر سید راجو قتالؒ)

[4] : رود کوثر از شیخ محمد اکرم، ص ۳۷۲

میں وفات پائی اور وہ وہیں مدفون ہوئے۔

حضرت قطب عالم نے اپنے خاندان کے دوسرے بزرگوں کی طرح رشد و ہدایت کا سلسلہ ہر اس جگہ جاری کیا جہاں وہ پہنچے۔ اس دوران انھوں نے مریدوں کی تعلیم اور عوام کی ہدایت کے لیے جو کچھ کہا اس کا کچھ حصّہ ملفوظات کی صورت میں مرآۃ سکندری اور مرآۃ احمدی کے نام سے کتابوں میں محفوظ ہے۔ یہ ملفوظات فارسی میں ہیں لیکن مخاطب اور مخاطب کی زبانوں کے اختلاف کے پیشِ نظر یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ ان ملفوظات میں سے بیشتر قدیم اُردو (مقامی زبان) میں ہوں گے جن کو مرتب کنندگان نے اس وقت کی علمی زبان فارسی میں تبدیل کر کے لکھ دیا ہوگا۔ مرآۃ احمدی کا اُردو زبان میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

حضرت قطب عالمؒ بابا فرید الدین گنج شکرؒ کی طرح اسی ملک میں پیدا ہوئے اس لیے ان کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ ہندی زبان نہیں جانتے ہوں گے درست نہیں۔ ان کے بیٹے حضرت شاہ عالمؒ کے ذکر میں مولوی عبدالحق نے اپنی تصنیف اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام میں لکھا ہے کہ[1] ایک روز سیّد راجو قتالؒ کے مناقب کا ذکر آیا ان کی والدہ کا نام جنت خاتون تھا۔ حضرت مخدومیہ نے ان کے حق میں زبان اُچھ (اُچ شریف کی زبان جو ملتانی ہے) میں فرمایا "تساں رلجے اساں خولجے" یعنی تم بادشاہ ہو اور ہم وزیر۔ اس سے کم از کم یہ بات تو ظاہر ہے کہ ان بزرگوں کے گھروں میں ہندی (مقامی) زبان بھی بولی جاتی تھی۔

میر علی شیر قانع نے تحفۃ الکرام میں حضرت قطب عالمؒ کے متعلق لکھا[2] ہے کہ جب ان کا قیام موضع بٹوہ میں تھا تو ایک رات جب وہ نماز تہجد کے لیے اُٹھے تو ان کو کسی چیز سے ٹھوکر لگی۔ بولے "لوہا ہے کہ لکڑ ہے کہ پتھر ہے"۔ اب اندازہ لگائیے

---

[1] اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام، ص ۲۹

[2] تحفۃ الکرام جلد اوّل از میر علی شیر قانع، ص ۱۷

کہ یہ فقرہ اُردو نہیں تو کیا ہے لیکن علی شیر قانع نے اس کے لیے ہندی کا لفظ ہی استعمال کیا ہے کیونکہ قدیم مورخ اور تذکرہ نگار ہر مقامی زبان کے لیے ہندی یا "زبان اہلِ ہند" کے الفاظ ہی استعمال کرتے تھے اس واقعہ اور جملہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ عام اور نجی گفتگو میں سید قطب عالمؒ مقامی زبان ہی سے کام لیتے تھے۔ کسی چیز سے ٹھوکر لگنے کے بعد اضطراری حالت میں جو زبان منہ میں آئے گی وہی ہو گی جو ہر وقت دانتوں میں رہتی ہو گی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جملے کی زبان ان کی روزمرّہ کی اور عربی فارسی ان کی علمی زبان تھی۔

میر علی شیر نے تحفتہ الکرام میں اس قسم کا ایک اور واقعہ بھی بیان کیا ہے لکھتے ہیں[1] کہ جب سید قطب عالمؒ کے بیٹے شاہ محمود کے ہاں شاہ راجو نامی فرزند پیدا ہوئے تو سید قطب عالمؒ نے کہا "بھائی محمود خوش ہو اساں تھیں وڈا، تساں تھیں وڈا ساڈے گھر جلال جہانیاں آیا۔" اس جملے میں پنجابی خصوصاً ملتانی خصوصیات صاف موجود ہیں۔ اساں تھیں بمعنی ہم سے اور تساں تھیں بمعنی تم سے ملتان کے علاقہ میں اب بھی بولا جاتا ہے یہاں تھیں بہ معنی سے ہے اور وڈا بمعنی بڑا ہے۔

سید قطب عالمؒ کے فرزند سید شاہ عالمؒ لکھتے ہیں کہ ایک روز میں والد صاحب کے حجرہ خاص میں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ بے چینی کے عالم میں اِدھر اُدھر پھر رہے ہیں اور ہندی زبان کے یہ الفاظ بول رہے ہیں۔

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بہر میں کھڑیا سائیں پریم نکلمائے[2] یہ جملہ حضرت قطب عالمؒ کے ملفوظات کے مجموعہ بنام جمعات شاہی میں موجود ہے۔ ملتان اور اس کے گرد و نواح کے علاقے میں بڑوں کے لیے سائیں اور لفظ کھڑیا اب بھی بولا جاتا ہے۔

سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے ایک مرید اور خلیفہ حضرت شاہ بارک اللہ چشتیؒ تھے جو احمد آباد میں مقیم تھے ان کے بارے میں مشہور ہے کہ سید قطب عالمؒ کے فرزند شاہ عالمؒ کا لقب انہوں نے رکھا تھا۔ کہتے ہیں کہ حضرت شاہ عالمؒ کو نبی کریم

---

[1] : تحفتہ الکرام، ص ۱۸

[2] : اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام، ص ۲۷

صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں آکر اشارہ دیا تھا کہ حضرت شاہ عالمؒ کا لقب ان کو بارک اللہ چشتیؒ عطا فرمائیں گے جب حضرت شاہ عالمؒ نے یہ خواب اپنے والد بزرگوار کو سنایا تو وہ فرمانے لگے "ور چشتیوں نے پکائی اور اسے بخاریوں نے کھائی" یہ جملہ بالکل اُردو معلوم ہوتا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت قطب عالمؒ اور ان کے فرزند ایسے جملے بھی بولتے تھے جو ملتانی اور پنجابی صرف و نحو سے ہٹ کر ریختہ کے قریب تھے۔ اس جملے میں "نے" کا استعمال پکانا اور کھانا کے معنی پکائی اور کھائی اسے یہ قربت عطا کرتا ہے۔

اس قسم کے جملوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے صوفیاء کرام نے دانستہ نہیں تو نادانستہ طور پر قدیم اُردو کی عوام سے آشنائی اور اسے ان میں ترویج کا کام ضرور کیا ہے۔ اگرچہ ان بزرگوں میں سے بعض کی باقاعدہ اور مستقل ہندی تصانیف کا وجود نہیں ملتا لیکن مذکورہ بالا قسم کے ہندی یا اُردو نما جملوں اور اقوال سے صاف شہادت ملتی ہے کہ وہ اپنی گفتگو میں قدیم اُردو (ہندی) کو استعمال کرنے سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ حضرت سراج الدین ابوالبرکات سید محمد مشہود بہ شاہ عالمؒ، شاہ قطب عالم کے فرزند تھے۔ ان کے ایک مرید نے ان کے اقوال و ملفوظات ایک کتاب میں جمع کیے ہیں[۲] جس کا نام جمعات شاہی ہے۔ اس میں حضرت قطب عالمؒ اور حضرت شاہ عالمؒ کے متعدد ہندی اور گوجری زبان میں اقوال پائے جاتے ہیں۔

حضرت شاہ عالم رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۸۸۰ھ)

سراج الدین سیدؒ نام اور شاہ عالم لقب تھا[۳] جو انہیں حضرت بارک اللہ چشتیؒ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک خوابی بشارت کی بنا پر دیا تھا۔ حضرت سید قطب عالمؒ

---

[۱]: اردوئے قدیم از شمس اللہ قادری (تاج پریس)، ص ۲۳، بحوالہ تحفۃ الکرام، ص ۱۷

[۲]: اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام، ص ۲۷

[۳]: اردوئے قدیم از شمس اللہ قادری، ص ۲۳ / ۲۴

ان کے والد بزرگوار اور حضرت جلال الدین بخاری مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ ان کے جد امجد تھے۔ اپنے آباؤ اجداد کی طرح حضرت شاہ عالمؒ بھی بڑے عالم اور ولی تھے میر علی شیر قانع نے تحفۃ الکرام میں حضرت شاہ قطب عالمؒ، حضرت شاہ عالمؒ اور حضرت بارک اللہ چشتیؒ کا ذکر کیا ہے اور اس خواب کا بھی ذکر کیا ہے جس کی بنا پر حضرت شاہ عالمؒ کو حضرت بارک اللہ چشتیؒ نے شاہ عالم کا لقب عطا فرمایا تھا اور اپنے والد بزرگوار سے اس خواب کے ذکر پر "چشتیوں نے پکائی اور اسے بخاریوں نے کھائی" کے الفاظ حضرت قطب عالمؒ کی زبان سے نکلے تھے۔ تفصیل اس کی حضرت قطب عالمؒ کے حالات میں گزر چکی ہے۔ اس سے شاہ عالمؒ کے بھی ہندی بولنے اور سمجھنے کی شہادت ملتی ہے۔[1]

مجموعہ ملفوظات جمعات شاہی میں حضرت شاہ عالمؒ کے ہندی اقوال بھی موجود ہیں ایک دفعہ حضرت شاہ عالمؒ کہنے لگے کہ مجھ پر کچھ عرصہ ایسی کیفیت طاری رہی کہ میں جو کچھ زبان سے نکالتا خدا اسے پورا کر دیتا اگر میں کسی سے کہہ دیتا کہ تیرے ہاں بیٹا ہو گا تو اس کے گھر بیٹا ہو جاتا۔ اگر کسی کو خبر دیتا کہ تیری عمر اتنی رہ گئی ہے تو وہ اس عرصہ سے گزرنے کے بعد مر جاتا۔ جب حضرت قطب عالمؒ فوت ہو گئے تو انہوں نے روحانی طور پر یہ بات میرے دل میں جاگزیں کر دی کہ میرے لیے ایسا کرنا مناسب نہیں ہے انھوں نے جو الفاظ حضرت شاہ عالمؒ کو بعد وفات کہے تھے وہ یہ تھے[2]۔

"اے چھوکرا ـــ بے ادبی گزار و گستاخی مکن"

یہ فقرہ جہاں باپ بیٹے کے اُردو کی جانب رجحان کا پتہ دیتا ہے۔ یہ تاثر بھی دیتا ہے کہ عربی اور فارسی کے علاوہ ہندی یا ہندی آمیز فارسی بھی عام گفتگو میں استعمال ہوتی تھی۔ عربی اور فارسی خصوصاً فارسی ہمارے قدیم علماء اور صوفیاء کی علمی زبان بن چکی تھی اور

---

[1]: تحفۃ الکرام از میر علی شیر قانع جلد اوّل ص ۱۷ / ۱۸

[2]: اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام، ص ۲۸

مذہب وتصوّف کی جملہ کتابیں وہ انہی زبانوں میں پڑھتے اور لکھتے تھے۔ اس لیے ہندوستان میں پیدا ہونے کے باوجود یہ زبانیں ہر وقت ان کے منہ میں رہتی تھیں اور عام گفتگو کے وقت غیر ارادی طور پر یہ ہندی الفاظ کے ساتھ مل کر اپنا مطلب ادا کرنے کے لیے آگے بڑھتی رہتی تھیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ آج انگریزی خواں طبقہ روزمرہ کی بات چیت میں اُردو اور انگریزی کا ملا جلا انداز اختیار کیے ہوئے ہے۔

ایک دن کا ذکر ہے حضرت شاہ عالمؒ گھڑ بہل پر سوار جا رہے تھے سلطان شاہ غزنی، جن کی شاہان گجرات سے رشتہ داری تھی، راستہ میں مل گئے۔ سلطان گھوڑے پر سے تو اُتر گئے لیکن انہوں نے حضرت شاہ عالمؒ کو سلام نہ کیا۔ یہاں مخدوم شاہ احمد نے جو حضرت شاہ عالم کے ساتھ تھے انہیں سلطان کی نخوت اور تکبر کا احساس دلایا۔ شاہ عالمؒ فرمانے لگے۔

"ارجن جی کا ادنہ بھایا ہوئے تو تجھ سے فقیروں کی برسوں تئیں کناسی کرے۔"

میر علی شیر قانع نے تحفۃ الکرام میں اس واقعہ کا ذکر کر کے یہ فقرہ اسی طرح لکھا ہے۔[1] اس جملے سے اس بات کا بھی انکشاف ہوتا ہے کہ کسی زبان کے اختیار کرنے سے زبان دان پر اس زبان کے ثقافتی اثرات کس حد تک مرتب ہوتے ہیں۔ ہندی اختیاری کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ شاہ عالمؒ کے پایہ کے بزرگ کو بھی اسلامی علامت کی بجائے ارجن کی ہندوانہ علامت استعمال کرنی پڑی ہے لیکن یہاں ارجن سے مراد ہندوانہ ارجن نہیں بلکہ پیر گرو وغیرہ مراد ہے۔ اس قسم کی مثالیں بعض دوسرے ایسے صوفیائے کرام کے ہاں بھی مل جاتی ہیں جنہوں نے اس طرز میں ہندی زبان کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا ہے مشہور چشتیہ بزرگ شیخ عبدالقدوس گنگوہی کا تو تخلص ہی الکھ داس تھا[2] جو اس بھگتی تحریک کا اثر معلوم

---

[1] تحفۃ الکرام از میر علی شیر قانع، ص ۴۱

[2] تحفۃ الکرام از میر علی شیر قانع، ص ۴۱

ہوتا ہے جو لودھیوں کے زمانے سے شروع ہو کر مغلیہ دور زوال تک اپنا اثر دکھاتی رہی ہے بھگتی تحریک کے اکثر شاعروں اور فقیروں نے اپنے نام داس ہی کے لاحقے کے ساتھ رکھے ہوئے تھے مثلاً سور داس، تلسی داس برہمن داس، چتربھج داس، رام داس وغیرہ حضرت عبدالقدوس گنگوہی نے اپنی ہندی شاعری کے لیے یہ تخلص اس ریت پر اس لیے رکھا ہوگا تاکہ ہندو عوام ان کی طرف بھی اپنے بھگتوں کی طرح راغب ہو سکیں۔

تحفۃ الکرام میں حضرت شاہ عالمؒ کی یہ ہندی بیت بھی موجود ہے[1]

کاندھی کا راجہ تم سر کوئی نہ بوجھے

سکیں کا راجا تم سر کوئی نہ بوجھے

اس بیت سے حضرت شاہ عالمؒ کے ہندی شاعری کی طرف رجحان کا ہلکا سا اشارہ ملتا ہے۔ ایک دفعہ کسی نے کہا کہ سقایہ میں اللہ کا نام نہیں لینا چاہیئے۔ حضرت شاہ عالمؒ نے آہستہ سے کہا کہ حق تعالیٰ خود مجھے نہیں چھوڑتا۔ بادشاہ گھوڑے پر سے نہیں اترتا۔ گھوڑا بیچارا کیا کرے۔ ان کے اصل الفاظ یہ ہیں۔

اینو بدو پربھو یا کیں اکھارے

ہوں لاج مروں بنک نبارو نہ ہوئے

یہ شعر ہو یا جملہ اس کی لفظی ثقالت نمایاں ہے۔ حضرت شاہ عالمؒ نے اپنے والد قطب عالمؒ کے مقابلے میں زیادہ ثقیل الفاظ استعمال کیے ہیں لیکن خالص ہندی کے اعتبار سے وہ زیادہ مناسب ہیں۔

پروفیسر ابراہیم ڈار نے اپنے ایک مضمون "گوجری اور اُردو زبان کی نشو ونما میں اہلِ گجرات کا حصّہ" میں ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے[2] کہ ایک دفعہ حضرت

---

[1] : تحفۃ الکرام از میر علی شیر قانع، ص ۱۴۱

[2] : مضمون، گوجری اور اُردو زبان کی نشو ونما میں اہل گجرات کا حصّہ از پروفیسر ابراہیم ڈار، رسالہ اُردو، اکتوبر ۱۹۵۰ء

شاہ عالمؒ نے محمود بیکرٹہ کو کہا تھا " پرٹھ ڈوکرے " (یعنی پڑھ اے بیٹے)۔ اس مضمون میں پروفیسر موصوف نے حضرت شاہ عالمؒ کے اس طرز کے اور جملے بھی لکھے ہیں جو ان کی قدیم اردو سے آشنائی کا یقین پتہ دیتے ہیں ایسے جملے اور اقوال حضرت شاہ عالمؒ کے مجموعہ ملفوظات بنام جمعات شاہی میں بھی ملتے ہیں ۔

شیخ بہا الدین باجنؒ رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۹۱۲ھ)

شیخ بہاؤ الدین باجنؒ حاجی معز الدین برہان پوری کے بیٹے اور شیخ رحمت اللہ[1] گجراتیؒ ابن شیخ عزیز اللہ متوکل کے مرید تھے۔ مؤلف خزینۃ الاصفیا نے شیخ رحمت اللہ[2] کی بجائے ان کے والد عزیز اللہؒ کا مرید بتایا ہے[2]۔ مؤلف تذکرہ گلزار ابرار نے شیخ باجنؒ کے بھائی شیخ میناںؒ کو بھی شیخ عزیز اللہ[1] کا مریدؒ بتایا ہے[3]۔ شیخ رحمت اللہ گجراتیؒ اپنے وقت کے مشہور بزرگ تھے، والی گجرات محمود بیکرٹہ بھی ان کا مرید تھا۔ شیخ بہاؤ الدین باجنؒ نے عمر کا زیادہ حصہ گجرات (بھارت) میں گزارا ہے آخری عمر میں انہوں نے برہان پور میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ کہتے ہیں کہ جب وہ حج کے لیے گئے تھے تو وہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں برہان پور (صوبہ خاندیس) کی سکونت اختیار کرنے کے لیے کہا تھا۔ مقصود اس علاقے کے لوگوں کو فیضان پہنچانا تھا۔ حضرت باجنؒ یہیں فوت ہوئے ہیں۔

شیخ بہاؤ الدین باجنؒ شاعر بھی تھے۔ فارسی اور ہندی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ باجنؒ ان کا تخلص تھا جس کے معنی ساز کے ہیں۔ اس تخلص سے اس بات کی بھی نشان دہی ہوتی ہے کہ شیخ بعض دوسرے قدیم بزرگانِ چشت کی طرح اپنی شاعری کو بھی راگ

---

[1] : تذکرہ محبوب الزمن از عبدالجبار ملکاپوری، ص، ۱۸۹

[2] ، پنجاب میں اردو از حافظ محمود شیرانی ص ۱۵۵، بحوالہ خزینۃ الاصفیا، ص ۴۱۱

[3] ، بحوالہ پنجاب میں اردو ، ص ۱۵۵

راگنیوں کے تابع رکھنا چاہتے تھے اس لیے کہ شعر میں کشش، وقت اور موسم کی نسبت سے اسے کسی سُر تال کے تابع کرنے سے زیادہ پیدا ہو جاتی ہے۔ اس فارمولے سے صوفیا چشت ہندوؤں کو مندر کی فضا سے نکال کر محفل سماع میں لائے ہیں اور اپنے دوہوں، شبدوں اور اشلوکوں کے ذریعے ان کو توحید کی وہ مے پلائی ہے کہ مندر گریز اور مسجد آشنا ہو گئے۔ سُر جسے ہندو خدا کہتے تھے اہرمن سے یزداں بن گیا۔

شیخ باجنؒ نے ایک کتاب اپنے مرشد کے حالات میں اور اپنے مریدوں کی ہدایت کے لیے لکھی ہے۔ کتاب کی زبان فارسی ہے لیکن اس میں بعض جگہ شیخ کا ہندی کلام بھی نظر آتا ہے۔ شیخ نے اس کتاب کی زبان کو دہلوی کہا ہے۔ نام اس کا خزانۂ رحمت ہے اور اس کے ایک مخطوطے کا ذکر محی الدین قادری زور نے اپنی تالیف مخطوطات جلد اوّل نمبر ۱۸۱ پر کیا ہے۔ سیّد ظہیر الدین نے مضمون گجرات کی مذہبی مثنویاں میں کہا ہے[1] کہ اس میں چند ہندی نظمیں مثنوی کی طرز پر بھی ہیں۔ انجمن ترقی اُردو کے مخطوطات میں ان کی ایک عجیب و غریب نظم جنگ نامہ "پیشوائے ساری و تہبند" کے نام سے بھی ہے۔ محی الدین قادری زور نے بھی مخطوطات جلد اوّل میں اس کا ذکر کیا ہے۔ حافظ محمود شیرانی "پنجاب میں اُردو" میں کہتے ہیں کہ شیخ باجنؒ پہلے شخص ہیں جنھوں نے (اپنی قدیم) زبان کو دہلوی کہا ہے[2] جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُردو اس زمانے میں برج بھاشا سے الگ زبان سمجھی جاتی تھی لیکن ان سے پہلے امیر خسروؒ نے بھی اپنی زبان کو ہندی کے ساتھ ساتھ دہلوی کہا ہے۔ پروفیسر ابراہیم ڈار نے اپنے مضمون "گوجری اور اُردو زبان کی نشو و نما میں اہلِ گجرات کا حصّہ" میں یہ بات کہی ہے[3]۔ البتہ شیخ باجنؒ کے ہاں عربی فارسی کا عنصر غالب ہے۔ ان کی زیادہ بحریں ہندی طرز کی ہیں۔ تاریخ برہان پور کے مصنف نے یہ بیت لکھ کر:

---

[1] رسالہ نوائے ادب، جنوری، ۱۹۵۰ء، ص ۶۶

[2] پنجاب میں اُردو، ص ۱۸۵

[3] رسالہ اُردو، اکتوبر ۱۹۵۱ء

روزے دھر دھر نماز گزاری دینی فرض زکوٰۃ
بن فضل تیرے چھوٹک ناہیں آگیں بکمیں بات

کہا[1] ہے کہ اس وقت ملک ہندوستان کی جو زبان تھی اس طرز پر تصوف کے مضامین پر کبھی کبھی کلمات شعر موزوں کرتے تھے۔

نمونہ کلام دیکھیے:

(۱) یوں باجن باجے ربے اسرار چھاجے
مندل من میں دھکے + رباب رنگ میں جھکے
صوفی ان پر ٹھمکے
یوں باجن باجے رے اسرار چھاجے

---

(۲) یہ نفتی کب کسی سے ملتی ہے
جب ملتی ہئے تب چھلتی ہے

---

(۳) راول دیول کہیں نہ جانا
بھٹا پہننا روٹھا کھانا
ہم درویشاں ایہی ریت
پانی لوریں ہور مسیت

---

(۴) دوہہ: باجن وہ کسی سریکھنا ہیں اور اس سریکھنا ہیں کوئے
جیسا کوئی من منہ چنت دے ویسا بھی نہ ہوئے

خزانہ رحمت کا آخری باب حضرت باجنؒ کے اسی قسم کے ہندی دوہوں خصوصاً

---

[1] : بحوالۂ اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۲۱

جکریوں سے بھرا پڑا ہے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ میرے اشعار کو ہندی میں جکری کہتے ہیں اور ہندوستان کے قوال ان کو سرود کے پردوں میں نوازتے اور گاتے ہیں۔ ان میں سے کچھ اشعار تو اپنے پیر دستگیر کی مدح میں ہیں اور کچھ ان کے روضے کے وصف میں ہیں۔ اپنے وطن گجرات کی تعریف اور عشق کے مقصد کے عنوان سے بھی ابیات موجود ہیں۔ اس قسم کے اشعار کتاب کے دوسرے حصے میں جگہ جگہ ملتے ہیں۔ مولوی عبدالحق نے ان اشعار پر رائے دیتے ہوئے کہا ہے[1] کہ ان کی زبان بہت صاف ہے اور بعض تو آج کے زمانے کے معلوم ہوتے ہیں مثلاً خدا کی توحید بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں :

(۱) نہ اُنہ جنیا نہ وہ جایا   نا انہ مائی باپ کہلایا
نہ اُنہ کوئی گود چڑھایا   باجن سب ان آپ بنایا

(۲) مسجد مسجد بانگاں دیویں بت خانے تیرا زور
میخانے بھیتر رنگ کرے ایسا تیرا شور

ریختہ کی قدیم قسم یعنی ہندی اور فارسی آمیز ان کا یہ شعر دیکھیے۔

عشقت را چو کردہ برسر تن من آگ لگاوے رے
جلوں بلوں ہور بل بل جاؤں تجھ تجھ بن پل نہ سوہاوے[2] رے

قاضی محمود دریائی بیرپوری رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۹۴۱ھ)

قاضی محمود دریائی گجرات کے اولیائے عظام میں سے تھے۔ اصل وطن بیرپور تھا۔ جوانی کے عالم میں احمد آباد آ گئے تھے۔ ان کے والد کا نام قاضی حمید تھا جو حضرت شاہ عالم کے مرید تھے۔ قاضی محمود دریائی کی بیعت اپنے والد بزرگوار سے تھی اور خلافت بھی انہی سے حاصل کی تھی۔ مولوی عبدالحق کہتے[3] ہیں کہ قاضی محمود دریائی کی شاعری

لے: اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام، ص ۳۲

لے: اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام، ص ۳۲

کا ایک نسخہ میرے پاس موجود ہے۔ اس میں انہوں نے کئی شعروں میں اپنے والد سے ارادت اور عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قاضی محمود دریائیؒ کو ان کے والد نے حضرت غوث الاعظمؒ کے روحانی اشارے پر خرقہ خلافت عطا کیا تھا۔ ان میں شاید اس لیے کرامات بھی پیرانِ پیر حضرت غوث الاعظم کی طرز کی تھیں۔ کہتے ہیں کہ ڈوبتے ہوئے اگر ان کو یاد کر لیتے تھے تو پار ہو جاتے تھے۔ سماع کے بڑے رسیا تھے طبیعت پر وجد و تو جد اور جذب و مستی کا رنگ غالب تھا۔ یہ رنگ ان کے شعروں میں بھی ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں کے شروع میں ان راگ راگنیوں کے نام بھی لکھ دیے ہیں جن میں وہ باندھی گئی ہیں۔ اشعار ہندی زبان میں ہیں لیکن گوجری اور فارسی کی آمیزش کے ساتھ۔

(۱) محمود کیری بینتی صاحب اتنی مانیں
نبی محمدؐ کی دوستی راکھیں مکھ کا پانیں

(۲) نینوں کا جل، مکھ تنبولا، ناک موتی، گل ہار
سیس نماؤں، نیہہ اپاؤں اپنے پیر کروں جو ہار

(۳) کوئی مایلا مرم نہ بوجھے رے
بات من کی کسے نہ سوجھے رے

(۴) دکھ جیو کا کسے کہوں اللہ دکھ بھریا سب کوئی رے
نردوکھی جگ میں کو نہیں میں پرکھی پھر پھر جوئی رے

پروفیسر ابراہیم ڈار نے اپنے مقالہ بہ عنوان "گجرات کا قدیم شاعر" میں کہا ہے[1] کہ قاضی محمودؒ دریائی کا ایک ہندی دیوان ہے جس کا ایک نسخہ احمد آباد کے ایک کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ دیوان سارے کا سارا ہندی زبان اور صوفیانہ رنگ کا ہے یہاں دیوان سے مراد ان کے کلام کا مجموعہ ہے نہ کہ حروف ابجد کے اعتبار سے ردیف وار مرتب کردہ دیوان

---

[1] رسالہ اُردو جولائی ۱۹۴۰ء۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار میں لکھا ہے[1] کہ قاضی محمود دریائیؒ نے ہندی زبان میں جکریاں بھی کہی ہیں۔ شیخ باجنؒ کے سلسلے میں بھی جکری کا ذکر ہو چکا ہے، جکری دراصل ذکر کی بگڑی ہوئی شکل ہے یعنی صوفیا کے ذکر کی ایک خاص شعری شکل ۔ خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے متعلق مشہور ہے کہ ایک دفعہ انھوں نے مولانا وجیہہ الدین گجراتیؒ سے جکری سنی تھی تو ان پر وجد کا عالم طاری ہو گیا تھا۔ جکری نے اصل میں اوراد و اذکار کو ترتیل کا رنگ دے دیا ہے اور یہی اس کی وہ خصوصیت ہے جو اسے عام شعر سے ممتاز کرتی ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار میں جہاں قاضی صاحب کی جکریوں کا ذکر کیا ہے ان کے متعلق یہ بھی رائے دی ہے کہ یہ بے تکلف، پُر تاثیر اور مرغوب طبائع ہوتی ہیں۔ سُر تال میں آکر عجب تاثر دکھاتی ہیں۔ قاضی محمود دریائیؒ کے شاگرد اور داماد عبدالرزاق نے اپنے استاد اور پیر کے حالات میں ایک کتاب لکھی ہے جس میں ان کی جکریاں کثرت سے ہیں۔[2]

شاہ علی محمد جیو گام دھنی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۹۷۳ھ)

شاہ علی جیو گام دھنیؒ سید احمد کبیر رفاعی کی اولاد میں سے تھے۔ وطن گجرات (بھارت) تھا۔ کتاب چشتیہ میں لکھا ہے[3] کہ مخدوم بہا الدین برنادیؒ خاتم التارکینؒ کے گجرات کے قیام کے زمانے میں شاہ علی جیو گام دھنیؒ نے اپنا ہندی کلام ان کو سنایا تھا جو عجیب وغریب اور پُر لذت بحور میں تھا۔ ان کے کلام کے مجموعہ کا نام جواہر اسرار اللہ ہے جس کو ان کے مرید شیخ حبیب اللہ ابن رزاق نے ان کی زندگی ہی میں مرتب کر لیا تھا۔[4]

---

[1] اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار، ص ۲۸۹ (اردو ترجمہ)

[2] مضمون گوجری اور اردو زبان کی نشو ونما میں اہل گجرات کا حصہ از پروفیسر ابراہیم ڈار، رسالہ اردو، اکتوبر ۱۹۵۰ء

[3] بحوالہ پنجاب میں اردو از حافظ محمود شیرانی، ص ۱۶۳

[4] پنجاب میں اردو، ص ۱۶۳

شمس القادری کا خیال ہے کہ اسے ان کے پوتے شاہ ابراہیم بن سیّد شاہ مصطفیٰ نے ترتیب دیا تھا[1] اصل میں یہ دو الگ الگ اشاعتیں ہیں۔ دونوں درست ہیں۔ کلام تقریباً توحیدی رنگ کا ہے مؤلف مرآۃ احمدیہ نے اسی لیے ان کا موازنہ فارسی کے شاعر مغربی سے کیا ہے جو عقیدہ ہمہ اوست کے قائل اور شارح تھے[2]۔

وحدۃ الوجود کا مسئلہ جو فارسی اور اردو شاعری کا پُرکشش اور دل فریب مضمون رہا ہے۔ قدیم صوفیاء کی ہندی شاعری کا بھی مقبول موضوع تھا۔ غلام ہمدانی مصحفی نے تذکرہ ریاض الفصحا میں شاہ مائل کا ذکر کرتے ہوئے جو یہ لکھا ہے[3] کہ "تصوف برائے شعر گفتن خوب است" (کہ تصوف شعر کہنے کے لیے خوب ہے) اس میں تصوف کے اس مسئلہ یعنی مسئلہ وحدۃ الوجود کو بڑا دخل ہے جس کے مختلف پہلوؤں سے فارسی اور اردو شاعروں نے عجیب و غریب اور پُر لذت مضامین پیدا کیے ہیں۔ لیکن یہ مسئلہ جتنا ہماری شاعری میں عام ہے اتنا دقیق اور پیچیدہ بھی ہے۔ بہ ظاہر وحدۃ الوجود کا مفہوم یہ ہے کہ خدا ہر شے میں موجود ہے اس لیے کثرت محض فریب ہے۔ اصل وحدت ہی ہے۔ کثرت میں وحدت کا مضمون یہیں سے پیدا ہوا ہے جب یہ غلط لوگوں کے ہاتھ چڑھا تو انھوں نے ہر شے میں خدا کی بجائے ہر شے کو خدا سمجھ لیا۔ اس سے ملحدوں، زندیقوں، بے دینوں، دنیا داروں اور ہوس کاروں نے گناہ ثواب، جنت دوزخ، مسجد مندر، کفر اسلام میں تمیز اٹھا دی اور اس طرح معاشرے میں الحاد پھیل گیا۔ اس میں قصور مسئلہ وحدۃ الوجود کا نہیں قصور اس کی روح کو نہ سمجھنے اور اغراض پرستوں کا ہے۔ مسجد میں گئے تو اذان دے دی مندر میں گئے تو ناقوس پھونک دی۔ مناجات کو جی چاہا تو کعبہ کی طرف منہ کر لیا۔ مستی میں آئے تو پائے خم پر سر رکھ دیا۔ یہ اور اس قسم کے مضامین بعض ناسمجھ لوگوں کے ذہن

---

[1]: اُردوئے قدیم، ص ۷۲

[2]: اردوئے قدیم، ص ۷۵

[3]: ریاض الفصحا (ذکر شاہ مائل)

و دماغ اور کلام میں بھی نظر آئیں گے جن کو دیکھتے ہوئے مستشرقین اور مغرب زدہ نقادوں نے اسے یونانی، ویدانتی اور نو فلاطونی اثر کا نتیجہ کہا ہے اور اس غلط سوچ کے زیر اثر ہمارے نقادوں نے بھی اسے زندقہ اور الحاد کہہ دیا ہے۔ اگر وحدۃ الوجود کا مفہوم یہی ہے جو ان لوگوں نے سمجھا ہے تو بے شک یہ ویدانت بھی ہے اور الحاد بھی۔ اس کی اشاعت میں ہندؤں کے بھگت شاعروں اور مسلمانوں کے گمراہ درویشوں نے بڑا کام کیا ہے۔ اکبری دور کے ہندو بھگت اور نام کے صوفیا اس میں خاص طور پر ملوث ہیں جن کے خلاف حضرت مجدد الف ثانیؒ کو بڑا اجہاد کرنا پڑا اور الحادی وحدۃ الوجود کے اثرات زائل کرنے کے لیے وحدۃ الشہود کا نظریہ پیش کرنا پڑا۔ وحدۃ الوجود کی مکمل نفی نہ کر سکنے اور اس کو وحدۃ الشہود کی شکل دینے کے اندر ہی یہ بات مضمر ہے کہ مسئلہ وحدۃ الوجود بے بنیاد نہیں بلکہ کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور رکھتا ہے۔ اسے اگر الحادی پردہ اٹھا کر دیکھا جائے تو اس کا چہرہ زیبا ضرور نظر آئے گا بلکہ ثقہ صوفیا کے نزدیک توحید خالص، وجودی توحید ہی ہے کیونکہ اگر ہم وجود دو مانیں ایک خدا کا اور ایک غیر خدا کا تو یہ تو شرک ہو گیا۔ اللہ تو کہتا ہے "لا موجود الا اللہ"، کہ اللہ کے سوا کچھ موجود نہیں تو پھر جو کچھ اللہ کے سوا موجود نظر آتا ہے وہ کیا ہے۔ بس مسئلہ وحدت الوجود اسی کو سلجھاتا ہے۔ شاہ علی جیو گام دھنی کا عقیدہ وحدۃ الوجود ہی تھا۔ وحدت الوجود اور وحدۃ الشہود میں صرف علمی اختلاف ہے کیفیاتی صورت یکساں ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے مکتوبات میں اسی لیے کہا ہے کہ "مقصود ہر دو یکے است"۔

شاہ علی جیو گام دھنی کا ایک کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ہندی میں فارسی بحروں کو استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہندی طرز شاعری میں عورت کی طرف سے اظہار عشق کا جو طریقہ اختیار کیا جاتا ہے وہ بھی ان کے کلام میں موجود ہے۔

(۱) آپیں کھیلوں آپ کھیلاؤں
آپیں آپس لے گل لاؤں

(۲) کبھیں سوں ہوئے اندھیاری راتا
سانج بتی کر لاوے دھاتا

(۳) ہو کر دیورا راتیں ساری
لاکر جوت دکھا دے بھاری

شاہ علی جیو گام دہنیؒ نے اپنے اشعار کو مکاشفات اور نکات کہا ہے اور ان کے مجموعہ کلام کے اشعار زیادہ تر انہی عنوانات کے تحت دکھائی دیتے ہیں مثلاً [1]

نکتہ اوّل در مکاشفہ

دیتے بھاؤ جو لیا یا لورے
سو کیوں بھیس کھجو بھی جھورے

نکتہ دوم

نو کھنڈ ہور جے اسمہ آہے
سب ہیو جہت نقیں جہتا ہوا ہے

اسی طرح کے دس نکتے مسلسل بیان ہوئے ہیں۔ شاہ جیو گام دہنیؒ نے ایک آدھ مقام پر فارسی بحر بھی آزمائی ہے۔ مکاشفہ درعقدہ کے عنوان سے دیکھیے۔

بچاری اہو لڑکی کھادو
دور نتھی آپ کوں کا دہو

اس کے بعد تقریباً بیس نکات پر مشتمل اشعار ہیں اور آخر میں نکتہ تخلص کا ایک عنوان بھی ہے۔

سو لٹکن لٹکتا آوے لٹک گل بانہ جب پا ہوے
علی تب چانپ گل لاوے

شیخ خوب محمد چشتی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۰۲۳ھ)

شیخ خوب محمد چشتیؒ گجراتی، شیخ کمال محمد سیستانیؒ کے مرید ہیں۔ وہ ایک

---

[1] : پنجاب میں اردو از حافظ محمود شیرانی (مکتبہ معین الادب لاہور) صفحات ۲۱۹ تا ۲۲۴

مشہور بزرگ اور صاحب تصنیف درویش تھے ان کے پیر شیخ کمال محمد شیخ وجیہہ الدین گجراتیؒ کے شاگرد اور خلیفہ تھے۔ گجرات سے وہ مالوہ چلے آئے تھے۔ کہتے ہیں کہ وجہ منتقلی سلطان مظفر سے ناراضی تھی[1]۔ علوم ادب و تصوف پر شیخ خوب محمد چشتیؒ نے چند کتابیں بھی لکھی ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام بھاؤ بھید ہے جس کا ایک نسخہ مولوی عبدالحق مرحوم کے پاس تھا[2]۔ اس میں شاعری کی صنعتوں کا ذکر ہے۔ صنائع کی بنیادی تشریح اور تعریف فارسی میں ہے لیکن ساتھ ہی گوجری زبان میں بھی مفہوم ادا کر دیا گیا ہے علم صنائع وہ علم ہے جس سے شعر میں حسن پیدا کیا جاتا ہے۔ فارسی اور اردو شاعروں نے اپنے کلام میں لفظی اور معنوی صنعتوں کو بڑے حسن و خوبی سے استعمال کیا ہے۔ شیخ خوب محمد چشتیؒ نے ان صنائع کی تعریف و تشریح کے بعد گوجری اشعار بھی دیے ہیں مثال کے طور پر صنعت تضاد کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "صنعت تضاد آں است کہ الفاظ چند ضد یک دیگر باشند (ترجمہ: کہ صنعت تضاد وہ ہے جس میں چند الفاظ ایک دوسرے کی ضد میں لائے جاتے ہیں) شیخ نے اس تعریف کے بعد یہ شعر دیا ہے:

دھیان خدا کا پکڑ جو چھوڑے اسے کہیں جگ مانہ
بھلا برا ہو تم پایا دیکھو سبل نہیل اس ٹھانہ

اس میں بھلا اور برا چھوڑنا اور پکڑنا ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

چھند چھند اسی قبیل کا ایک اور رسالہ ہے جس کا تعارف ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اپنے ایک مضمون اُردوئے قدیم کے دو نادر مخطوطات میں کیا ہے[3]۔ یہ کتاب دو الگ حصوں یا رسالوں میں ہے پہلے رسالے میں صرف عروض ہندی کا ذکر ہے اور ہندی کے

---

[1]: اُردوئے قدیم از شمس اللہ قادری، ص ۷۷

[2]: اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام ص ۲۷،

[3]: مضمون اردوئے قدیم کے دو نادر مخطوطات، رسالہ اُردو جولائی ۱۹۵۲، ص ۸۰

اوزان کی فارسی کے اوزان سے مطابقت دکھائی گئی ہے۔ دوسرے رسالے میں عروض کی باتیں ہیں اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عربی اوزان کے ساتھ ہندی کی تال بھی لکھی ہے۔ ڈاکٹر موصوف کے خیال میں اس موضوع پر یہ اُردوئے قدیم میں پہلی تصنیف ہے۔

بھاؤ بھید اور چھند چھنداں کی اہمیت یہ بھی ہے کہ مصنف نے فارسی بحروں کو ہندی میں مقبول بنانے کی کوشش کی ہے، جیسا کہ بعد میں ریختہ نے فارسی بحروں کو مقبول کیا ہے۔ پروفیسر ابراہیم ڈار ٹھیک کہتے ہیں کہ اُس انقلاب انگیز تغیر نے اُردو کے مستقبل کا فیصلہ کر دیا جس کے مطابق فارسی بحروں اور خیالات کو ہندی میں منتقل کیا گیا۔ محمد قلی قطب شاہ فرماں روائے گولکنڈہ کی قدیم اُردو (دکنی) شاعری میں اس کا اثر نمایاں نظر آئے گا۔ یہی اثر ولی اورنگ آبادی سے ہوتا ہوا شمالی ہند کی اردوئے معلیٰ تک پہنچا ہے۔ اس سے ایک اور بات کا بھی پتہ چلتا ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں نے تو قدیم دور ہی سے ہندوؤں کی زبان سے مفاہمت شروع کر دی تھی لیکن جیسا کہ ہندو مذہب کی فطرت کسی دوسرے مذہب کو برداشت کرنے کی نہیں ہے۔ ہندوؤں نے ہندو مسلمان کی مشترکہ زبان کی تشکیل کو دیوناگری رسم الخط اختیار کر کے ناممکن بنا دیا۔ اگر عربی رسم الخط ہی قبول کر لیا جاتا تو آج پورے برّصغیر کی ایک ہی زبان ہوتی۔ نام اس کا ہندی ہوتا یا اُردو اس میں کوئی خرابی نہیں تھی اور فارسی الفاظ کے دخل سے اُردو اور سنسکرت الفاظ کے دخیل ہونے سے ہندی اور اُردو کی جو الگ الگ روئیں چلتی رہی ہیں یہ بھی نہ ہوتا اور دونوں زبانیں ایک ایسے دریا کی طرح ہوتیں جس میں سنسکرت، عربی اور فارسی تینوں زبانوں کے سنگریزے موجود ہوتے لیکن یہاں کی برہمنی فضا نے یہ بھی نہ ہونے دیا۔ ہمارے صوفیاء نے، جیسا کہ ہم تھوڑا بہت اب تک دیکھ رہے ہیں، مقامی زبان اختیار کر کے ہندوؤں کو مسلمانوں کے ساتھ الگ لسانی شناخت ختم کرنے کی لاشعوری طور پر دعوت دی ہے لیکن برہمن نے شعوری طور پر اور ایک سوچے

لے مضمون گوجری اور اردو زبان کی نشوونما میں اہل گجرات کا حصہ از پروفیسر ابراہیم ڈار، رسالہ اردو، اکتوبر ۱۹۵۰

سمجھے طویل منصوبے کے تحت اس اتحاد کو نہ صرف یہ کہ قبول نہیں کیا بلکہ اس کی راہ میں ہر مرحلہ پر رکاوٹیں کھڑی کی ہیں اور یہ عمل آج تک جاری ہے۔

شیخ خوب محمد چشتیؒ کی تیسری تصنیف خوب ترنگ کے نام سے ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اپنی کتاب اُردو شہ پارے میں اس کا نام خوش ترنگ لکھا ہے[1] لیکن صحیح نام خوب ترنگ ہی ہے یہ کتاب مثنوی کی طرز میں ہے اور اس کا موضوع وہی صوفیائے قدیم کا مشترکہ موضوع، شریعت، طریقت، عرفان، رشد وغیرہ ہے۔ یہ کتاب دکنی نظم میں ہے مصنف نے خود ہی اس کی شرح فارسی زبان میں لکھی ہے اور اس کا نام امواج خوبی رکھا ہے۔ شرح لکھنے کی ضرورت اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ اس خوب ترنگ کا موضوع کتنا دقیق اور باریک ہے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو احساس ہوا ہے کہ وہ اپنے موضوع کا گوجری زبان میں صحیح طور پر ابلاغ نہیں کرسکا کیوں کہ اس وقت تک یہ زبان محدود تھی اور کتاب کا موضوع وسیع۔ دوسری بات یہ بھی ہوسکتی ہے کہ مصنف نے جو باتیں گوجری میں عوام کے لیے کی ہیں ان کو ان لوگوں تک پہنچانا چاہتا ہو جو گوجری ناآشنا اور فارسی آشنا ہیں۔ خوب ترنگ کے دو نسخے انڈیا آفس لندن کے کتب خانے میں موجود ہیں۔ ایک نسخہ امواج خوبی کا بھی ہے[2]۔ جیسا کہ صوفیائے چشت کا دستور اپنے مرشدوں کے اقوال کو محفوظ کرکے کتابی صورت دینے کا رہا ہے، یہ کتاب بھی شیخ محمد چشتیؒ کے پیر و مرشد حضرت شیخ کمال سیستانیؒ کے ملفوظات لیے ہوئے ہے۔ یہ بات اس کتاب کے ان اشعار سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔

میں مرشد تھیں سنیا بات   دے مرشد صاحب عرفان
جنہو مجھے سکھایا دین   جن تھیں منجہ دل ہوا یقین

خوب ترنگ ایک چھوٹی بحر کی مثنوی ہے۔ زیادہ حصہ توحید اور وجودی توحید پر

---

[1] ، اُردو شہ پارے   از محی الدین قادری زور، ص ۱۵

[2] ، مضمون اُردوئے قدیم کے دو نادر مخطوطے   از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، رسالہ اردو جولائی ۱۹۵۲ء ص ۸۰

روشنی ڈالتا ہے اس میں موجود، وجود، اسم، صفت، وحدت، احدیت، الہیت وغیرہ کے دقیق اور باریک عنوانات ہیں۔ وجود اور اس کے مراتب سے خصوصی طور پر بحث کی گئی ہے۔ کتاب میں ایک جھولنا بھی ہے۔ اس پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کہتے ہیں[1] کہ جھولنا نظم کی ایک قسم ہے جو ہندوستانی زبانوں میں مختلف ناموں اور شکلوں میں موجود ہے۔ اس میں چار مصرعے ہوتے ہیں لیکن انداز رباعی اور مربع سے مختلف ہوتا ہے یعنی نہ تو رباعی کی طرح پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتا ہے اور نہ مربع کی طرح چار مصرعوں کا۔ البتہ اس میں ردیف قافیہ کی پابندی ہوتی ہے۔ اس میں پہلا دوسرا اور پھر تیسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ ہوتا ہے۔ وزن چاروں مصرعوں کا ایک ہوتا ہے اور یہ وزن رباعی کے اوزان سے باہر ہے۔

شیخ خوب محمد چشتیؒ نے کتاب کی زبان کے متعلق خود ہی اس کے دیباچے میں لکھا ہے کہ میں نے گجراتی زبان میں جو عربی اور فارسی آمیز ہے، یوں کہا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی کتابوں کی زبان گوجری ہے، عربی اور فارسی الفاظ کی آمیزش والی گوجری۔ محمد عاصم برہان پوری نے جو شیخ نور اللہ رمز الٰہی خلیفہ شیخ برہان الدینؒ کے مرید تھے خوب ترنگ کو فارسی نظم میں ڈھالا ہے اور نفحات حیات نام رکھا ہے، یہ ۱۱۶۵ھ کی تصنیف ہے۔ اسی طرح ارکاٹ (جنوبی ہند) کے محمد نامی (متوفی ۱۱۵۵ھ) ایک بزرگ نے خوب ترنگ کے بعض دقیق اشعار کی شرح لکھی ہے اور اس کا نام مفتاح التوحید رکھا ہے۔ اس عمل سے خوب ترنگ کی اہمیت اور مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

مولوی عبدالحق کہتے ہیں کہ تصوّف میں خوب محمد چشتیؒ کی کئی کتابیں ہیں، ان میں سے بعض میرے پاس ہیں[2]۔ ان کی ایک کتاب حجۃ البقا ہے جس میں انہوں نے خود اپنی زبان کو جہاں گوجری کہا ہے۔ اس کے اختیار کرنے کی تائید بھی فرمائی ہے کہتے ہیں[3]

---

[1] مضمون اردوئے قدیم کے دو نادر مخطوطات از ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی، رسالہ اردو جولائی ۱۹۵۲، ص ۸۰

[2] اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام، ص ۴۷

[3] پنجاب میں اردو، ص ۲۲۷

ے جے ہو دیں گیان بجاری ⁂ نہ دیکھس بھاکا گجری

یعنی جو صاحب عرفان ہیں وہ گجری (گجراتی) زبان کا خیال نہ کریں گے۔

شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۹۴۵ھ)

شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ شیخ اسماعیل کے بیٹے اور شیخ محمد چشتی صابریؒ کے مرید تھے[1] گنگوہ کے رہنے والے تھے۔ وہ صوفیائے چشت میں اہم حیثیت کے حامل بزرگ ہیں۔ ان کی تصانیف میں انوار العیون، رسالہ قدسیہ، نور الہدیٰ، قرۃ العین، رشد نامہ وغیرہ اہم ہیں[2]۔ ان کے فارسی ملفوظات بھی ملتے ہیں۔ ہندی شعروں میں وہ الکھ داس تخلص کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندی شاعری کے لیے اس زمانے کے شاعر داس کے اسی لاحقہ سے تخلص اختیار کر رہے تھے تلسی داس، سور داس، رام داس وغیرہ۔ حضرت گنگوہی نہ رام کے داس نہ ارجن کے داس، وہ تو صرف الکھ (اللہ) کے داس تھے اس لیے انہوں نے داس کے لاحقہ کو بھی قائم رکھا اور اپنی شناخت کو بھی نہ کھویا۔

ان کی کتاب رشد نامہ فارسی میں ہے۔ توحید، وجودی توحید اور عرفان و معرفت کے دیگر مضامین پر مشتمل ہے۔ اس میں ذیلی طور پر ان کے ہندی اشعار بھی آ گئے ہیں۔ ان شعروں کی زبان پوربی ہے۔ ان میں راگ راگنیوں کے انداز بھی ہیں۔ شبد، اشلوک، دوہرہ، عقدہ وغیرہ اصناف بھی ہیں۔ کوئی کوئی شعر ریختہ کی طرز میں یعنی ہندی فارسی آمیز الفاظ لیے ہوئے بھی ہے مثلاً

صدق رہبر، صبر توشہ، منزل دل رقیق
ست نگری، دھرم راجہ، جوگ مارگ

مراد یہ ہے کہ صدق سچا شہد ہے صبر اور اچھا کام حاکم ہے اور دل کی رقت (خضوع، عاجزی، تبتل وغیرہ) صحیح راستہ ہے۔

---

[1]: اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار از شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۲۱

[2]: پنجاب میں اردو از حافظ محمود شیرانی، ص ۱۶۱

دوہرا دیکھیے

جدھر دیکھوں بے کھی دیکھوں ہور نہ کوئے
دیکھا بوجھ بچار میں سبھی آپیں سوئے

اشلوکوں کی زبان سنسکرت آمیز معلوم ہوتی ہے اور ان میں ہندوانہ مذہب کے رموز و علائم کو عارفانہ مضامین کے لیے استعمال کیا گیا ہے مقصود وہی ہندوؤں کو دین اور معرفت کا درس ان کی زبان، ان کی مصطلحات اور ان کی علامات میں دینا۔ ان کا جسم ہندوانہ اور روح مسلمانی ہوتی ہے۔ ہندو اس جسم کی کشش میں جب ان کو پڑھتے یا سنتے تھے تو ان کے دلوں میں روح شعر اتر جاتی تھی جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے شبد، اشلوک، دھرپد، بشن پد، وغیرہ ہندی شاعری کی اسی طرح کی اصناف ہیں جس طرح قصیدہ، رباعی، غزل وغیرہ فارسی زبان و شاعری کی اصناف ہیں۔ جس طرح ہم نے ایرانیوں کی ان اصناف کو لے کر ان میں مسلمانی رنگ کی روح پھونک دی ہے اسی طرح صوفیائے چشت نے ہندی زبان اور اس کی اصناف میں بھی مسلمانی روح داخل کر دی ہے۔ نہ وہ عیب تھا اور نہ یہ۔ نقط شبد، اشلوک، دھرپد، بشن پد، جیسے ناموں سے گھبرانا نہیں چاہیے اور صوفیا پر کوئی تہمت نہیں لگانی چاہیے بلکہ ہمیں تو انہیں شاباش کہنی چاہیے کہ انھوں نے ان ہندی اصناف کو اسی طرح مسلمان کر لیا تھا جس طرح وہ ہندوؤں کو کلمہ پڑھا کر کرتے تھے۔ اس طرح روح دونوں میں مسلمانی آجاتی تھی۔ اس اشلوک کو دیکھیے کتنی دقیق زبان میں ہے۔

اپا ناشت، پرانا شت، ناشت، کنجت جکترا
بدھ باچا منو ناشت، تتر دیوی اکل تبا

ظاہر ہے کہ اس قسم کے اشعار کو ہم اس اعتبار سے تو اردوئے قدیم کے نمونہ کے طور پر پیش کر سکتے ہیں کہ ان کا رسم الخط عربی ہے لیکن اگر اسلوب کو دیکھا جائے تو یہ بہت ہی نامانوس اور اجنبی ہے۔ البتہ شیخ کے وہ اشعار جو پوربی میں ہیں وہ صاف اور رواں ہیں۔

اس شبد کو دیکھیے

پھلے نہ پھولے آوے نہ جائے
کالنی کا سید کالنی ہی سمائے

دوہرا

آپ گنوائیں پی ملے پی کھوئے سب جائے
الکھ کتھا ہے پیرم کی جے کوئی بوجھے مائے

سرود در پردۂ پوربی

دھن کارن پی آپ سنوارا — بن دھن سکھی کنت کنھارا
نہ کھیلے دھن ماہیں ایوان — باس پھول مہنن اچھے جیواں
کیوں نہ کھیلوں تج سنگ میتا — مجھ کارن تیں اپنا کیتا
الکھ داس آکھے سن سوئی — سوئی پاک ارتہ پہن سوئی

عقدہ

الکھ داس اکھے سن لوے ✽ دوئی دوئی کہو مت بھائی کوئی

خاتم التارکین شیخ بہاأالدین برناوی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۰۳۰ھ)

مخدوم بہاأالدین برناویؒ شیخ فریدالدین برناویؒ کے پوتے تھے۔ شیخ فریدالدینؒ کو مہاجر مکی بھی کہتے ہیں۔ یہ باوا فریدالدین گنج شکرؒ سے الگ بزرگ ہیں اور تقریباً ۹۸۷ھ میں فوت ہوتے ہیں۔ شیخ بہاالدینؒ خاتم التارکین کے لقب سے مشہور تھے۔ وہ اپنے دادا سے روحانی جانشین تھے۔ انہوں نے ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں کی سیر کی ہے شہنشاہ اکبر اور شہنشاہ جہانگیر سے بھی ملے ہیں۔ موسیقی سے ان کو عشق

کی حد تک تعلق تھا۔ حافظ محمود شیرانی نے پنجاب میں اردو میں لکھا ہے کہ[1] "مسلمانان ہندوستان میں صرف دو شخص فن موسیقی میں یگانہ روزگار مانے گئے ہیں، امیر خسروؒ اور شیخ بہاالدینؒ (خاتم التارکین)۔ امیر اس کا دیباچہ ہیں اور مخدوم اس کا تمت ہیں۔"

حافظ محمود شیرانی کی یہ رائے غیر محتاط معلوم ہوتی ہے۔ بے شک امیر اور مخدوم فن موسیقی میں بہت ماہر تھے لیکن ان کی صف میں اعلیٰ مہارت کے کچھ اور لوگ بھی نظر آتے ہیں مثال کے طور پر فارسی کے شاعر اور نقشبندیہ بزرگ شاہ گلشن دہلویؒ کو تذکرہ نگاروں نے خسرو ثانی اور خسرو زماں لکھا ہے[2]۔ یہ القاب انہیں موسیقی میں مہارت تامہ ہی کی بنا پر تو ملے ہیں۔ بہرحال مخدوم بہاالدین برناویؒ نے بعض دوسرے موسیقی دان، صوفی شاعروں کی طرح قول خیال، ترانہ، سادرہ، دھرپد، بشن پد، خیال، جکری اور چٹکلہ وغیرہ میں ہندی شعر کہے ہیں۔ وہ ساز خیال اور ساز کھڑسک کے موجد بھی ہیں۔ حافظ محمود شیرانی نے کتاب چشتیہ کے حوالے سے کہا ہے کہ ان کا بہت سا کلام دوسروں کے نام پر مشہور ہو گیا ہے[3] اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ انہوں نے شعروں میں اپنا تخلص استعمال نہیں کیا بلکہ انہوں نے تخلص رکھا ہی نہیں۔

تجرد اور تفرد ان کا دنیا کے لیے ہی نہیں تخلص کے لیے بھی ہے ایسی ہی چیزوں کی بنا پر انہیں خاتم التارکین کہا گیا ہے، کلام ان کا اس طرز کا ہے۔

ان نیننن کا یہی بیسیکھ

ہوں تجھ دیکھوں تو ں منجھ دیکھ

مخدوم کے ابیات مقصدی بھی ہیں۔ مثال کے طور پر بیماری سے شفا، خواجہ خضر سے

---

[1] پنجاب میں اردو، ص ۱۷۶

[2] گل رعنا (فارسی) از لچھمی نرائن، شفیق اورنگ آبادی (مخطوطہ)، ص ۲۵۲ پ
تفصیل کے لیے دیکھیے مقالہ شاہ گلشن دہلوی از ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم، مجلہ تحقیق ۱۹۸۷

[3] پنجاب میں اردو، ص ۱۷۶

ملاقات، حضرت سلطان الاولیا نظام الدین زری زر بخت دہلوی کی زیارت، بارش ہونے بارش بند ہونے وغیرہ کے عمل کے لیے ان کے ہندی اشعار ملتے ہیں۔ مثال کے طور پہ بارش مانگنے کے لیے ان کا یہ شعر بطور عمل ہے۔

کاہے اے بدرا ناں برست کاہے بھی ناہن گرجت کاہے ناں جھڑ لاوت
کاہے بھی برکھا رُت یتوت برمن من چنوت کاہے بھی ناں گھوگھو تاوت

مخدوم علاؤالدین ثانی کی کتاب "کتاب چشتیہ" میں لکھا ہے کہ یوں تو شیخ تینوں زبانوں میں شعر کہتے تھے لیکن ہندی میں اکثر لکھتے تھے[1]

شیخ محبوب عالم عرف شیخ جیون رحمۃ اللہ علیہ

شیخ محبوب عالم عرف جیونؒ گیارہویں صدی ہجری کے عالم اور صوفی ہیں۔ سید میراں بھیک چشتیؒ متوفی ۱۱۳۱ھ سے خلافت پائی ہے۔ محشر نامہ، دردنامہ، فقہ ہندی خواب نامہ پیغمبرؐ، بی بی فاطمہ خاتون وغیرہ ان کی تصانیف ہیں جن کا ذکر اسپرنگر نے فہرست کتب خانہ اودھ میں کیا ہے۔ فقہ ہندی کو بعض مولانا عبدی کی تصنیف کہتے ہیں حافظ محمود شیرانی نے پنجاب میں اُردو میں مولانا مذکور اور ان کی تصنیف فقہ ہندی کا ذکر کیا ہے[2]

شیخ محبوب عالمؒ کی جملہ تصانیف مذہبی نوعیت کی ہیں اور ان کی زبان ہریانوی ہے جسے بعض بانگرُہ بھی کہتے ہیں۔ یہ زبان مشرق میں اُردو، شمال میں اُردو پنجابی، مغرب میں پنجابی اور راجستھانی وغیرہ بولی جانے والی زبانوں میں محصور علاقے کی زبان ہے۔ ہریانوی زبان اُردو کے بہت قریب ہے کیونکہ دہلی کے قریب ہونے کی وجہ سے اس

---

[1] بحوالہ پنجاب میں اُردو از حافظ محمود شیرانی (۱۹۳۶ء ایڈیشن)، ص ۲۳۶
[2] پنجاب میں اُردو، ص ۲۵۳ / ۲۹۵ / ۳۰۷ (مکتبہ معین الادب لاہور ایڈیشن)

زبان پر مسلمانی اثرات بہت رہے ہیں[1] یہاں ان کی ایک تصنیف وردنامہ کا ذکر کیا جاتا ہے جس میں پونے تین ہزار کے قریب اشعار ہیں۔ حافظ محمود شیرانی اس کا تعارف کراتے ہوئے کہتے ہیں[2] کہ اس کی زبان رائج الوقت اردو سے بہت مختلف ہے لیکن جس وقت یہ کتاب تصنیف ہوئی ہے اس وقت اس کتاب اور دہلی کی زبان میں بہت کم فرق تھا. نمونہ :

جیوں میں پہل نام رحمٰن کا
تیوں گیان میں دھیان سبحٰن کا
صحی ایک کرتار وہ پاک ہے
کھڑا جس کی قدرت سے افلاک ہے
وہی ہے جو کرتار عالم خدا
نرنجن ، نرنکار، سب سے جدا

شیخ جیونؒ بہت سے الفاظ کی املاوہ لکھتے ہیں جو وہ مناسب سمجھتے ہیں جیسے صحیح کو صحی ۔ ہندوانہ اثرات کے تحت انہوں نے کرتار ، نرنجن ، نرنکار جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں لیکن ان کو اپنے مسلمانی معنی دیے ہیں۔

شیخ جیونؒ نے بڑی رواں اور چست شاعری میں واقعات اسلامی بھی نظم کیے ہیں، مثال کے طور پر واقعہ احد لکھتے ہوئے کہتے ہیں۔

ہوئے پھر مقابل قریشوں کے تب نبیؐ اور اصحاب اک بار سب
عکاسہ طرف داہنی کوں کھڑا ابوسلمہ بائیں طرف یہ پڑا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر شیخ جیونؒ نے حضرت عائشہ صدیقہؓ، حضرت فاطمہؓ اور شیخین کی طرف سے مرثیے بھی لکھے ہیں جو غزل کی شکل میں ہیں۔ حافظ محمود شیرانی نے پنجاب میں اردو میں ان کا ذکر مرثیہ کے لفظ ہی سے کیا ہے لیکن شیخ خود انہیں دوہرے کہتے ہیں[3] اس سلسلے میں حضرت عائشہؓ کا مرثیہ (لطرز دوہرا) دیکھیے۔

---

[1] : پنجاب میں اردو، ص ۲۵۲ (مکتبہ معین الادب لاہور ایڈیشن)
[2] : ″ ″ ″ ، ص ۲۵۳ ″ ″ ″ ″
[3] : ″ ″ ″ ، ص ۲۵۶

سکھ چین کے گھر سووتی لاگا کلیجے تیر اب
دکھ نین بھر بھر رووتی بھاری پڑی ہے پیڑ اب

حضرت عمرؓ کا مرثیہ (بطرز دوہرا)

محمدؐ یاد نا جو کوں پڑا دن رین کرلاؤں
کھڑا فریاد ماں کو کوں محمدؐ سا کہاں پاؤں

یہ ایک ایک شعر اس نظم سے لیا گیا ہے جس کو شیخ جیونؒ نے دوہرا کہا ہے اور اس میں کئی اشعار ہیں۔ یہ ہیئت کے لحاظ سے دوہرے ہیں لیکن مضمون کے اعتبار سے مرثیے۔ کیونکہ مرثیہ کسی مرنے والے کے فضائل بیان کر کے اسے یاد کرنا یا اس کی یاد اور جدائی میں اپنے دکھ اور رنج کا اظہار کرنے کا نام ہے۔

شیخ علی متقی مرید حسام الدین متقی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۹۷۵ھ)

شیخ علی بن حسام الدین متقیؒ کے والد کا نام عبدالمالک تھا۔ ان کے آباؤ اجداد جون پور سے برہان پور (صوبہ خاندیس) میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ ابھی شیخ علیؒ کی عمر پانچ برس ہی کی تھی کہ ان کے والد نے انہیں شیخ باجن چشتیؒ کے پاس لے جاکر ان کا مرید کرا دیا دیا۔ اس واقعہ کے تھوڑے عرصے کے بعد شیخ علیؒ کے والد کا انتقال ہو گیا۔ علی متقی عمر کے اقتضا اور ضروریات انسانی کے اعتبار سے پہلے دنیا میں مشغول رہے پھر محبت الٰہی کے جذبے نے انہیں ہمیشہ کے لیے خدا کے راستے پر لا کر کھڑا کر دیا۔ شیخ عبدالحکیم ابن شیخ باجن چشتیؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے خرقہ خلافت حاصل کیا پھر ملتان جاکر شیخ حسام الدین متقیؒ کی خدمت میں رہے۔ ان کے علاوہ وہاں جو اور علماء اور مشائخ موجود تھے ان سے بھی فیض یاب ہوئے وہاں ایک بزرگ شیخ محمد بن محمد سخاویؒ سے سلسلہ قادریہ کے، شیخ ابو مدین شعیب مغربیؒ سے سلسلہ مدینہ کے اور شیخ نورالدین ابو الحسن الحسنیؒ

سے سلسلہ شاذیہ کے معارف و رموز بھی حاصل کیے۔ شیخ حسام الدین علی متقی سے دو سال تک تفسیر بیضاوی اور عین العلم پڑھی وہاں سے حرمین شریفین کی زیارت کے لیے مکہ معظمہ چلے گئے اور وہاں ایک عرصہ تک شیخ ابوالحسن بکریؒ کی صحبت میں رہے[1]

شیخ علیؒ نے تصنیف و تالیف میں بھی بہت کام کیا ہے۔ شیخ عبدالحق محدث نے کہا ہے کہ ان کی چھوٹی بڑی کتابوں کی تعداد سو ہے۔ یہ عربی اور فارسی میں ہیں۔ شیخ عبدالوہاب متقی نے شیخ علی متقیؒ کے حالات میں ایک مختصر کتاب لکھی ہے جس کا نام اتحاف التقی فی فضل شیخ علی متقی ہے اس کتاب سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ علی متقی کی وفات ۹۷۵ھ میں مکہ معظمہ میں ہوئی ہے۔

شیخ علی متقیؒ کو ہندی اور فارسی دونوں زبانوں کی شاعری سے رغبت تھی۔ انہوں نے اپنے انتقال سے تین چار ماہ پہلے ماہ صفر ۹۷۵ھ کی ایک رات اپنے مریدوں یا عزیزوں کو کہا کہ فلاں کا شعر پڑھو۔ ان کے ایک طالب نے اپنی فراست سے کام لیتے ہوئے یہ شعر پڑھا۔

ہرگز نہ آید در نظر نقشے ز رویت خوب تر
شمسے ندانم یا قمر حورے ندانم یا پری

اس شعر نے ان کی عجیب حالت کر دی اور وہ اسے بار بار سنتے رہے اسی اثنا میں ان کا خادم آیا اور کہنے لگا کہ کھانا حاضر ہے۔ آپ نے ملازم سے کہا کہ اس کو پیس کر اتنا باریک کر دو کہ اس کی تمام چیزیں ایک ذات ہو جائیں اور اس کا ذرہ ذرہ آپس میں یوں مل جائے کہ پہچانا نہ جا سکے اور جیسا کہ اس دوہرے میں ہے ذرات غذا میں دوئی نہ رہے اور پھر انھوں نے یہ ہندی دوہرہ پڑھا

سن سہیلی پرم کی ماتا
یوں مل رہیے جوں دودھ نباتا

---

[1] حالات کے لیے دیکھیے اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار از شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۴۳۵ تا ۴۵۳ (اردو ترجمہ)

اس سے شیخ علی متقیؒ کی ہندی دانی کا بخوبی ثبوت بہم پہنچتا ہے۔ اس کا مزید ثبوت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی کتاب "زاد المتقین فی سلوک طریق الیقین" سے ملتا ہے۔ شیخ محدث اس میں لکھتے ہیں کہ[1] ایک دفعہ ایک ایسی صحبت میں مسئلہ وحدۃ الوجود کا مسئلہ چھڑا جس میں" میں وہ خود اور شیخ عبداللہ مغربی فقیہہ بھی تھے۔ شیخ علی متقیؒ کہنے لگے یہ شخص خشک فقیہہ ہے اور بڑا کٹر ہے۔ اس کے سامنے ایسی باتیں نہ کہو۔ اسی کتاب میں شیخ محدث نے کہا ہے کہ شیخ علی متقیؒ ہر شخص کے ساتھ اس کی زبان میں گفتگو کرتے تھے چنانچہ ہندیوں کے ساتھ ان کی بات چیت ہندی میں ہوتی تھی۔ یہ وہ اصول ہے جو صوفیائے چشت نے ابتدا سے قائم رکھا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ان کے لیے دوسروں تک دین کا ابلاغ مشکل بلکہ ناممکن ہوتا۔ ان کی ہندی اختیاری کی یہ مجبوری تھی اگر برصغیر کے لوگوں کی زبان کچھ اور ہوتی تو انہیں اس کو سیکھنا اور اس میں کلام کرنا پڑتا۔

شیخ رزق اللہ رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۹۸۹ھ)

شیخ رزق اللہ مشہور عالم اور محدث شیخ عبدالحق دہلویؒ کے چچا تھے۔ ان کے والد شیخ سعد اللہ اور ان کے چچا دونوں شیخ محمد ملاوہؒ (متوفی ۹۰۰) کے مرید تھے۔ شیخ محمد ملاوہؒ شاہ جلال گجراتیؒ کے، شاہ جلال گجراتی شیخ پیارےؒ کے اور شیخ پیارے سید یداللہؒ کے مرید تھے جو مشہور چشتیہ بزرگ سید محمد بندہ نواز گیسو درازؒ کے خلیفہ اور پوتے تھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی خود بھی چشتیہ سلسلے میں شیخ علی متقیؒ کے مرید تھے۔ نقشبندیہ سلسلے میں انہوں نے بعد میں بیعت کی ہے اور خواجہ باقی باللہؒ کے ہاتھ میں ہاتھ دیا ہے حضرت مجدد الف ثانیؒ شیخ سرہندی کا بھی یہی حال ہے وہ پہلے چشتیہ خاندان میں بیعت تھے اور بعد میں خواجہ موصوفؒ کے ہاتھ پر نقشبندیہ سلسلے میں بیعت ہو گئے تھے۔

---

[1] اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار از شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۳۰۹/۳۱۰ (اردو ترجمہ)

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اپنی کتاب اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار میں کہتے ہیں[1] کہ ان کے چچا رزق اللہ ہندی اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ آپ کی ہندی نظموں کے مجموعے پیمان اور جوت نرنجن کے نام سے موجود ہیں۔ ہندی میں راجن اور فارسی میں مشتاق تخلص کرتے تھے۔ صوفیا کا مشترکہ موضوع یعنی تصوف و عرفان اور رشد و ہدایت ان مجموعوں کا بھی بنیادی موضوع ہے۔ زبان اس دور کی ہندی طرز کی ہے۔ شیخ محدث کہتے ہیں کہ آپ ہر بات بڑی خوش اسلوبی اور روانی سے بیان کیا کرتے تھے۔ آپ کی مثل بہت کم اولیاء اللہ گزرے ہیں آپ نہایت اطمینان سے اور بے نظیر انداز سے گفتگو کیا کرتے تھے۔ محبت کی باتوں کو بڑے شوق سے کہتے اور سنتے تھے اور اس وقت اکثر و بیشتر آبدیدہ ہوا کرتے تھے۔ ہندی اور فارسی کے شاعر بھی تھے۔ مدت دراز تک ہندی زبان میں شعر کہتے رہے آپ کی نظموں کا مجموعہ پیمان اور جوت نرنجن نہایت مقبول ہے۔ مولوی عبدالحق نے پیمان اور جوت نرنجن دو الگ مجموعے بتائے ہیں لیکن اخبار الاخیار کے ایک مترجم نے[2] (جیسا کہ اوپر لکھا ہے) ان دو کو ایک کر دیا ہے پیمان و جوت نرنجن کے نام سے جو صحیح نہیں۔

شیخ حسین صوفی چشتی رحمۃ اللہ علیہ

شیخ حسین صوفی چشتیؒ دہلی کے رہنے والے اور شیخ سلیم چشتیؒ کے مرید تھے اور فتح پور سیکری کی خانقاہ کے درویشوں میں شامل تھے۔ ان کا ایک دیوان اور چند دوسری تصانیف ہیں ان میں سے ایک کتاب کا نام دل و جان ہے جو منظوم ہے۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں اس کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس میں ہندوستانی رنگ ہے۔ مضمون بھی ان کا اپنا نہیں بلکہ میر علی شیر کی کتاب حسن و دل سے لیا ہوا ہے۔ کتاب

---

[1] اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار (اردو ترجمہ)۔ ص ۳۰۹ / ۳۱۰

[2] اردو ترجمہ اخبار الاخیار ترجمہ از مولانا محمد فاضل (شائع کردہ مدینہ پبلشنگ)

حسن و دل اور اس کا جیرہ یہ جان و دل دونوں فارسی میں ہیں اور کئی ہزار اشعار پر مشتمل ہیں۔
لیکن یہاں ملا بدایونی[1] کا یہ بیان قابل غور ہے کہ جان و دل میں ہندوستانی رنگ ہے اردو اور فارسی کتابوں میں مقامی رنگ کی موجودگی بھی ایک اہم بات ہے۔ صوفیائے چشت کی ہندی اختیاری بھی ان کا مقامی رنگ ہی ہے۔ موسیقی میں ہندی سر تال اور راگ رنگ سے شغف بھی اسی بنا پر ہے اور شیخ حسین صوفیؒ کا اپنے فارسی دیوان اور دوسری تصانیف میں ہندی اور مقامی رنگ کا اختیار کرنا ہندی یا قدیم اُردو ہی کی طرف ایک قدم ہے۔ جلی نہ سہی خفی ہی سہی۔

خواجہ محمد چشتی رحمۃ اللہ علیہ

خواجہ محمدؒ مولانا بدرالدین اسحٰقؒ کے صاحبزادے اور شیخ فرید الدین گنج شکرؒ کے نواسوں میں سے تھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار میں لکھتے ہیں[2] کہ جامع علوم اور حاوی فنون تھے طب میں بھی دسترس رکھتے تھے اور علم موسیقی میں بھی کامل تھے۔ ان کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انہوں نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے ملفوظات بھی انوار المجالس کے نام سے جمع کیے تھے۔ وہ محبوب الٰہیؒ کی زندگی میں ان کی مسجد کے امام بھی تھے۔ ایک دفعہ حضرت ابوبکر طوسی کی خانقاہ پر جو دریا کے کنارے تھی قوالی کی محفل ہو رہی تھی حضرت محبوب الٰہی بھی وہاں موجود تھے۔ قوال بے حد کوشش کر رہے تھے لیکن حاضرین مجلس میں سے کسی کو حال نہیں آرہا تھا اس پر حضرت محبوب الٰہیؒ نے کہا قوالی ختم کر کے بزرگوں کے حالات اور قصے بیان کیے جائیں۔ جب بزرگوں کا ذکر شروع ہوا تو لوگوں پر وجد کا سماں طاری ہو گیا۔ اسی دوران شیخ علی زنبیلیؒ نے شیخ بدرالدین غزنویؒ کے خلیفہ شیخ نظام الدین پانی پتیؒ کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ ہم تو قوالی کے خواہش مند تھے۔ اس پر شیخ نظام الدین محبوب الٰہیؒ نے خواجہ محمدؒ کی طرف اشارہ کیا چنانچہ وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر قوالوں

---

[1]: منتخب التواریخ (اُردو ترجمہ)، ص ۶۸۲ / ۶۸۳

[2]: اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار (اُردو ترجمہ) ص ۱۷۶

کی جگہ پر جا بیٹھے ان کے ساتھ غالباً شیخ نظام الدین پانی پتیؒ بھی شامل ہو گئے۔ جب اس شعر پر پہنچے تو ساری محفل پر ذوق و شوق کی کیفیت طاری ہو گئی اور نظام الدین پانی پتیؒ کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو گئے۔

ہر بے خبری کہ بینی امشب
از من ہمہ در گذار تا روز

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ محمد چشتیؒ کو بھی دوسرے صوفیائے چشت کی طرح سماع کا ذوق تھا بلکہ وہ تو خود بھی ماہر موسیقی تھے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے سلسلے کے دوسرے صوفیا کی طرح ہندی موسیقی کے ماہر بھی ہوں گے۔

مولانا محمد ابراہیم خوش دل رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۱۹۵ھ)

محمد ابراہیمؒ نام، خوش دل تخلص، لاہور کے مشہور اہل علم چشتی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ حافظ محمود شیرانی نے اپنی کتاب پنجاب میں اردو میں ان کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے[۱] کہ ان کے والد قاضی ضیاء الحق اپنے عم بزرگوار مولانا نظام الدین اور اپنے چھوٹے بھائی بہاء الحق کے ساتھ ایران سے ہندوستان آئے تھے۔ لاہور میں علاقہ گڑھی شاہو میں قیام پذیر ہوئے تھے۔ انہیں نواب خان بہادر نے اپنے بیٹے کا اتالیق مقرر کر دیا تھا۔ مولانا محمد ابراہیمؒ علم و فضل میں یگانہ روزگار تھے لیکن سکھوں کے عمل دخل کے زمانے میں ان کا گھر بار لوٹ لیا گیا اور انہیں ہر قسم کی جائداد سے بے دخل کر دیا گیا ناچار ایک مسجد میں، جو مطبع کوہ نور کے بالمقابل تھی، امامت کرنے لگے اور معلمی کو پیشہ بنا لیا۔

مولانا ابراہیم خوش دلؒ نے ایک نظم لکھی ہے جس کی زبان اردو نما پنجابی ہے۔ اور چرخہ نامہ کی طرز پر ہے جس میں دنیا کو بڑھیا اور جسم انسانی کو چرخہ تصور کیا گیا ہے۔ پنجابی زبان میں ڈھول نامہ، پنکھا نامہ، چرخہ نامہ طرز کی بہت سی نظمیں لکھی گئی ہیں۔ یہ اسی زنجیر کی ابتدائی کڑی ہے۔

---

[۱] : پنجاب میں اردو، ص ۳۷۱ تا ۳۷۹

عشق کے غم سوں ہوں محزوں　　آہ دنیا سب مکر دنوں
جو توں چاہے قادر کوں　　اس عالم سوں ہو بیروں
کدھر کی بودھیا کدھر کا توں
چل میرے چرخے چرخ چوں

اے رنگین دیوانہ　　ہو عالم سوں بیگانہ ہو
دل پر تو پروانہ ہو　　وہ ہیگا بے شبہ دنوں
کدھر کی بودھیا کدھر کا توں
چل میرے چرخے چرخ چوں

اس نظم کے ستّرہ بند ہیں یہ پنجاب میں اُردو میں موجود ہے۔

شیخ علی مولا رحمۃ اللہ علیہ

حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ کے مجموعہ ملفوظات خیر المجالس میں ایک درویش بنام علی مولا کا ذکر ہے جو شیخ جلال الدین تبریزیؒ کے مرید تھے[1] وہ اگرچہ پنج وقتی نماز کے سوا کچھ نہ جانتے تھے لیکن ان کا مرتبہ روحانی اور درجہ باطنی یہ تھا کہ جملہ مشائخ و علماء ان سے برکت حاصل کیا کرتے تھے۔ حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ کہتے ہیں کہ ایسے مقبول الٰہی تھے کہ جو دیکھتا جان لیتا تھا کہ یہ اولیائے کرام میں سے ہیں[2]۔ حمید شاعر قلندر نے اپنے مرشد حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ کی زبانی ان کے پیر حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا ایک واقعہ خیر المجالس میں بیان کیا ہے جس سے نہ صرف یہ پتہ چلتا ہے کہ شیخ علی مولاؒ کا صوفیائے چشت سے کیا رابطہ تھا بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندی دان بھی تھے۔

جب حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ نے اپنے استاد مولانا اصولی سے کتاب قدوری

---

[1] خیر المجالس مرتبہ حمید شاعر قلندر (اُردو ترجمہ)، ص ۱۹۰

[2] خیر المجالس مرتبہ حمید شاعر قلندر (اُردو ترجمہ)، ص ۱۹۲

تمام کی تو استاد نے کہا مولانا نظام الدین اب دستار فضیلت باندھو۔ جناب شیخ چار گز لمبی پگڑی باندھتے تھے جو اس وقت میسّر نہ تھی، اپنی والدہ شریفہ سے آکر کہا استاد نے دستار بندی کا حکم فرمایا ہے، میں کہاں سے لاؤں۔ ان کی والدہ شریفہ نے کہا کہ خاطر جمع رکھو اس کی تدبیر ہو جائے گی انھوں نے روئی خرید کر جولاہے سے دھنوائی۔ آدھی اپنے پاس رکھی اور آدھی کنیز کو دی کہ جلد کاتے پھر ایک نور باف (جولاہے) کو جو ان کا پڑوسی تھا پگڑی بنانے کے لیے سوت دیا اس نے دو تین دن میں پگڑی تیار کر کے دے دی پگڑی اور کچھ پیسے لے کر حضرت نظام الدین اپنے استاد مولانا علاء الدینؒ اصولی کے پاس گئے اور دستار اور پیسے ان کی خدمت میں پیش کیے۔ استاد نے کچھ اور ملا کر اپنے پاس سے کھانا پکوایا اور پھر فرمایا علی مولا کو بلاؤ۔ ان دنوں بدایوں میں دو علی مولا تھے؛ ایک علی مولا خورد اور دوسرے علی مولا بزرگ۔ علی مولا خورد کو بلایا گیا۔ وہ بڑے صاحب دل اور صاحب قبولیت تھے۔ بعد کھانا کھلانے کے مولانا علاء الدین اصولیؒ نے وہ پگڑی اٹھائی اور کھول کر اپنے دست مبارک میں لی اور شیخ نظام الدین (اولیاءؒ) سے کہا کہ قریب آکر پگڑی باندھو۔ شیخ نے پگڑی باندھ کر اپنے استاد کے قدموں میں چند بار سر رکھا۔ شیخ علی مولاؒ نے یہ محبت اور ادب دیکھ کر مولانا نظام الدین اصولیؒ سے ہندی زبان میں کہا:

"ارے مولانا یہ بڑا ہوسی"

یعنی اے مولانا یہ مرد بزرگ ہوگا، پھر دوبارہ ایسا ہی فقرہ کہا جس کا مفہوم تھا کہ بہت بڑا بزرگ ہوگا۔ اس پر مولانا علاء الدین اصولیؒ نے شیخ علی مولاؒ سے کہا کہ کہاں سے جانا کہ وہ بڑا بزرگ ہوگا۔ وہ بولے میں اس میں دو باتیں دیکھتا ہوں اور ہندی میں کہا:

"جو منڈاسا باندھے سو پائیں نہ پرے"

یعنی جو دستار فضیلت باندھتا ہے پھر وہ کسی کے پاؤں پر نہیں گرتا، دوسری بات انھوں نے اس مفہوم کی کہی کہ اس کی پگڑی ریشمی نہیں سادہ ہے۔

شیخ علی مولاؒ پیدائشی مسلمان نہ تھے بلکہ بعد میں شیخ جلال الدین تبریزی کے ہاتھ پر مسلمان ہو کر انہی سے بیعت ہوئے تھے ان کے مرشد شیخ ابوسعید تبریزی تھے خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور شیخ بہاء الدین زکریاؒ سے

ان کے دوستانہ تعلقات تھے۔ مشائخ چشت کی کتابوں میں بھی حضرت جلال الدین تبریزیؒ کا ذکر ملتا ہے۔ مولانا سید مبارکؒ نے سیر الاولیاء میں ان کے بابا فرید الدین گنج شکرؒ سے ایک مکالمے کا ذکر بھی کیا ہے۔ مولانا عبدالحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے حوالے سے لکھا ہے[1] کہ شیخ جلال الدین تبریزی کی دلی مرادیں بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ سے پوری ہوئی ہیں۔ مزار ان کا بنگال میں ہے۔ ان حالات و واقعات سے شیخ علی مولاؒ کے چشتیہ خاندان سے روابط کا پتہ چلتا ہے۔

شیخ دانیال چشتی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۹۹۴ھ)

شیخ دانیال چشتیؒ آٹھویں صدی ہجری کے ایک بزرگ ہیں جن کے متعلق حافظ محمود شیرانی نے کتاب پنجاب میں اردو میں لکھا ہے کہ وہ ہندی کے اعلیٰ شاعر تھے۔ شہنشاہ اکبر کا بیٹا دانیال بھی ہندی کا شاعر تھا، یہ بزرگ اس سے الگ ہیں۔ ان دو صدیوں میں یعنی آٹھویں اور نویں صدی ہجری میں سلاطین اور امراء نے بھی ہندی شاعری اور موسیقی میں کافی حصہ لیا ہے، اور شعراء اور بزرگوں نے از خود بھی ان میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ سلطان حسین جونپوری متوفی ۹۳۵ھ نے انہی صدیوں میں سترہ[1] راگ ایجاد کیے تھے۔ اس کا دربار ہندی اور بنگالی شاعروں سے آباد تھا اور ہندی زبانوں کی سرپرستی میں ان کا نام بقول حافظ شیرانی آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے[2]۔ قطبن نے ہندی کی مشہور تصنیف مرگاوتی اسی بادشاہ کے نام پر معنون کی ہے۔ بھاگوت گیتا اور مہا بھارت کا ترجمہ بنگالی زبان میں اسی کے حکم سے ہوا تھا۔ شیخ دانیال چشتی بھی اسی دور کے شاعر ہیں۔ حافظ محمود شیرانی نے صرف اتنا لکھا ہے کہ[3]:

> "شیخ دانیال چشتی آٹھویں صدی ہجری میں پیدا ہوتے ہیں اور ایک سو گیارہ سال کی عمر پاکر ۹۹۴ھ میں رحلت کرتے ہیں ہندی کے اعلیٰ شاعر تھے۔"

اس سے زیادہ ان کے کام خصوصاً ہندی شاعری کے متعلق معلوم نہیں ہو سکا۔

---

[1]: اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار (اردو ترجمہ)، ص ۹۱۔ [2]: پنجاب میں اردو، ص ۱۶۲ [3]: پنجاب میں اردو

سیّد میراں بھیک چشتی رحمۃ اللہ علیہ

سیّد محمد سعید المخاطب بہ سید میراں بھیک چشتی صابری عہد عالم گیر کے بزرگ ہیں۔ محمد علی نے تاریخ منظفریہ میں لکھا ہے کہ حنفیہ مذہب اور قادریہ مشرب رکھتے تھے[1]۔ بعض نے انہیں سہروردی سلسلے کا درویش کہا ہے لیکن ان کی اصل نسبت چشتیہ خاندان سے تھی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ دوسرے سلسلوں میں بھی بیعت ہوں کیونکہ ایک بزرگ کا ایک سے زیادہ سلسلوں سے فیض یاب ہونا ثابت ہے۔ اپنے وقت کے صاحبِ حال و مقام صوفی تھے۔ نواب روشن الدولہ اور کئی دوسرے اکابر و اصاغر ہند ان کے ارادت مند تھے۔ کوئی سو سال کی عمر پائی ہے۔ زندگی کا زیادہ عرصہ موضع بھیک میں گزارا ہے جلوس دہم محمد شاہی میں فوت ہوئے ہیں۔ حافظ محمود شیرانی نے پنجاب میں اردو میں لکھا ہے کہ :

"وہ ہندی زبان کے قابل شاعر تھے۔ قوال ان کے اشعار اب تک گاتے ہیں"

بھیکا بھوکا کوئی نہیں سب کی گٹھڑی لال
گرہ کھول نہیں جانتے اس بدھ بنے کنگال

ان کا یہ ہندی شعر عوام میں بڑا معروف ہے اور صوفیا کے اس کلیے کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ خدا ہر ایک کے من میں ہے۔ صرف تلاش کرنے کی ضرورت ہے جس نے تلاش کیا پا لیا۔ سچ کہا ہے اقبال نے ؎

جنہیں ہم ڈھونڈتے تھے آسمانوں میں زمینوں میں
وہ نکلے میرے خلوت خانۂ دل کے مکینوں میں

اس میں اپنے آپ کو پہچاننے اور اپنی معرفت حاصل کر کے اپنا مقام پانے کی طرف اشارہ بھی ہے۔ جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے خدا کو پہچان لیا۔ اقبال کے فلسفۂ خودی

---

[1] : تاریخ منظفری، ص ۵۶

کی بنیاد اسی حقیقت پر ہے " خدا جوئی بخود نزدیک تر شو"۔

شیخ جنید موہانی چشتی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۹۰۱ھ)

شیخ جنید موہانی چشتیؒ عربی فارسی اور ہندی تینوں زبانوں کے شاعر تھے۔ حافظ محمود شیرانی نے اپنی کتاب پنجاب میں اردو میں ان کا اور ان کی ہندی شاعری کا ذکر کیا ہے[1]۔ وہ شیخ پیر محمد سلون متوفی ۱۰۷۴ھ کے ہم عصر تھے۔ شیخ پیر محمد بھی ہندی اور فارسی کے عمدہ شاعر تھے۔ حافظ محمود شیرانی نے جن شیخ جنید کا ریختہ طرز کی قدیم شاعری کے سلسلے میں ذکر کیا ہے وہ غالباً یہی بزرگ ہیں وہ کہتے ہیں کہ ان کے حالاتِ زندگی معلوم نہیں البتہ وہ یہ لکھتے ہیں کہ ان کا تعلق جماعت صوفیا سے تھا[2]۔

دلا غافل چہ می خپسی کہ اپنی سیج تھیں ڈریئے
جو روز مرگ در پیش است اتنی نیند کیو کریئے
چو زر در اندر کیں باشد کے جو نیند بنجارا
نباشد سود یک جیتل گوادے مول بھی سارا

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے بھی ایک شیخ جنید کا ذکر کیا ہے اور ان کو حصار (پنجاب) کا بزرگ اور شاعر بتایا ہے۔ اس لیے قیاس کہتا ہے کہ یہ وہی بزرگ ہیں جن کا حافظ محمود شیرانی نے ذکر کیا ہے۔ شیخ محدث کہتے ہیں[3] کہ یہ شیخ فرید الدین گنج شکرؒ کی اولاد میں سے تھے۔ ظاہری عظمت و بندگی کے مجسمہ تھے۔ آپ فن کتابت میں ماہر تھے۔ زود نویسی کی یہ حالت تھی کہ تین دن میں پورا قرآن مع اعراب کتابت کیا کرتے تھے۔ اسے دراصل آپ کی کرامت کہنا چاہیئے آپ نے بعض رسائل

---

[1]: پنجاب میں اردو ، ص ۱۶۲

[2]: پنجاب میں اردو ، ص ۳۰۵ (۱۹۳۶ء ایڈیشن حیدر آباد دکن)

[3]: اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار اردو ترجمہ (مدینہ پبلشنگ کراچی) ، ص ۵۶۵

میں دنیا کی عجیب اور نادر چیزیں سپرد قلم کی ہیں جو کہ سمجھ سے باہر ہیں خدا ہی جانے آپ کا مقصد کیا ہے اور ان کی کیا تاویل کی جا سکتی ہے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ کی اولاد میں سے کچھ لوگوں نے آپ کی تصنیفات کی ان انوکھی اور نادر چیزوں کے حالات وغیرہ اس لیے کتابوں میں سے مٹا دیے ہیں کہ یہ باتیں لوگوں کی سمجھ سے بہت دور ہیں۔

شیخ احمد نہروانی رحمۃ اللہ علیہ

شیخ احمد نہروانیؒ قاضی حمید الدین محمد بن عطا ناگوریؒ کے مرید تھے۔ قاضی حمید الدین ناگوری اگرچہ سلسلہ سہروردیہ میں شیخ شہاب الدین سہروردی کے خلیفہ تھے لیکن ان کی مصاحبت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی چشتیؒ سے بھی تھی۔ ان کا مزار بھی خواجہ قطب الدین بختیار کعکیؒ کے پائیں میں ایک اونچے چبوترے پر ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار میں لکھا ہے[1] کہ قاضی حمید الدینؒ نے خواجہ قطب الدینؒ کے پائیں میں عظمت خواجہ کے پیش نظر اپنا مزار قدرے نیچا رکھنا چاہا لیکن آپ کی اولاد کو یہ بات پسند نہ آئی اور انھوں نے آپ کے مزار کا چبوترہ خواجہ قطب الدینؒ کے مزار سے اونچا تعمیر کر دیا۔ آپ کی وفات ۶۲۵ھ میں ہوئی۔

شیخ احمد نہروانیؒ انہی قاضی حمید الدین محمد بن عطا ناگوریؒ متوفی (۶۲۵ھ) کے مرید تھے جن کی سلسلہ چشتیہ سے اس قسم کی نسبت پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے ان کا ذکر بھی یہاں کر دیا گیا ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ نے بھی شیخ احمد نہروانیؒ کا نام بڑی عزت اور احترام سے لیا ہے اور یہ دونوں چشتیہ مسلک کے بزرگ تھے یہ بھی کہا گیا ہے کہ شیخ احمد نہروانیؒ اس مجلس سماع میں بھی موجود تھے جس میں خواجہ قطب الدین بختیارؒ نے جان، جان آفریں کے سپرد کی تھی۔ شیخ احمد نہروانیؒ پیشہ کے لحاظ سے بافندہ تھے حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی کہتے ہیں کہ ان کو کبھی کبھار کرگھے پر کام کرتے کرتے ہی ایسی استغراقی حالت طاری ہو جاتی تھی کہ وہ اس عالم میں بے خود ہو کر کپڑا بننا چھوڑ دیتے تھے لیکن کرگھا خود بخود

---

[1] : اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار، ص ۹۷ (اردو ترجمہ)

چلتا رہتا تھا اور کپڑا خود بخود بنتا رہتا تھا۔

شیخ محدّث نے کہا ہے کہ ایک دفعہ قاضی حمید الدین ناگوریؒ آپ سے ملنے آئے اور ملاقات کے بعد جاتے ہوئے کہا۔ شیخ احمد کب تک اس کام میں مشغول رہو گے۔ یہ کہہ کر قاضی صاحب تو چلے گئے اور شیخ احمد میخیں کسنے کے لیے اُٹھے جو ڈھیلی پڑ گئی تھیں۔ ابھی ایک میخ ہی کسنا چاہتے تھے کہ ان کا ہاتھ ٹوٹ گیا جس پر شیخ احمد نہروانیؒ نے ہندی زبان میں کہا۔ اس پیر قاضی حمید الدین نے میرا ہاتھ توڑ دیا۔ پھر اس واقعہ کے بعد انھوں نے بافندگی کا پیشہ چھوڑ دیا اور مکمل طور پر یادِ الٰہی میں مشغول ہو گئے۔ شیخ محدث نے ان کے ذوقِ شعری کا ذکر بھی کیا ہے۔[۱]

شیخ جمالی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۹۴۲ھ)

شیخ جمالیؒ کا اصلی نام جمال خان تھا۔ پہلے جمال تخلص کرتے تھے لیکن اپنے پیر و مرشد مولانا سماءُ الدین خلیفہ سیّد جلال الدین جہانیاں جہاں گشتؒ کے کہنے پر جمالی تخلص کر لیا تھا۔ شیخ جہانیاں جہاں گشتؒ اگرچہ سہروردی سلسلے میں قطب الاقطاب شاہ رکن عالم ملتانیؒ کے مرید تھے لیکن ان کو دوسرے خانوادوں سے بھی فیض حاصل تھا۔ سب سے پہلے وہ اپنے والد ماجد سیّد احمد کبیرؒ کے مرید تھے۔ پھر اپنے عمّ بزرگوار سیّد محمد غوثؒ سے فیض یاب ہوئے پھر جا کر شیخ رکنؒ عالم کی غلامی اختیار کی۔ اس کے بعد آپ نے دنیا بھر کے مشائخ کی زیارت کی اور تقریباً بیس مشائخ کے خرقہ ہائے خلافت حاصل کیے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے وہ چشتیہ سلسلے سے بھی ربط رکھتے تھے۔ شیخ محدث مولانا عبدالحق نے، اخبار الاخیار میں انھیں شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کا خلیفہ بتایا ہے، اس لیے یہاں شیخ جمالی کا ذکر بھی صوفیائے چشت کے حلقہ میں کر دیا گیا ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار میں لکھتے ہیں[۲] کہ شیخ جمالیؒ نے اپنی ہمت اور قابلیت کی وجہ سے

---

[۱] : اخبار الاخیار فی تذکرۃ الابرار، ص ۹۷

[۲] : اخبار الاخیار، ص ۳۹۲ (اُردو ترجمہ) (ذکر جلال الدین بخاری)

شاعری میں بھی کمال حاصل کیا۔ اقسام شاعری میں قصیدہ، غزل، مثنوی وغیرہ فارسی زبان میں کہتے تھے۔ ان کے اشعار سے فارسی دان حضرات اچھی طرح واقف ہیں۔ نعت کا یہ مشہور شعر انہی کا ہے ؎

موسیٰ زہوش رفت بہ یک جلوۂ صفات
تو عین ذات می نگری و تبسمی

ملا عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں ایک غزل کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے[1] کہ یہ انہوں نے ہندی طور پر لکھی ہے۔ اس غزل کا مطلع یہ ہے

روز و شب مونسم خیال شماست
فاسئلوا عن حالکم خبری

مولانا کے اس جملے سے شیخ جمالیؒ کے ہندی کی طرف رجحان کا پتہ چلتا ہے۔

---

[1] منتخب التواریخ۔ اردو ترجمہ، ص ۲۱۴ / ۲۱۵

ضمیمہ

(چند ایسے قدیم شاعر جن کا مسلک چشتیہ ہے۔)

ملک محمد امین کمال

جنوبی ہند میں امین نام کے دو تین شاعر ہوئے ہیں؛ ایک تو امین الدین اعلیٰؒ تھے جن کا ذکر گزر چکا ہے، ایک میر محمد امین تھے جنہوں نے مثنوی یوسف زلیخا مقامی زبان میں لکھی ہے۔ یہ ملک محمد امین وہ ہیں جنہوں نے بہرام گور اور حسن بانو کا قصہ نظم کیا ہے۔ ان کے متعلق نصیر الدین ہاشمی نے کتاب دکن میں اُردو میں صرف اتنا لکھا ہے کہ[1] وہ بیجاپور کے باشندہ تھے اور ابراہیم عادل شاہ کے زمانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ہاشمی نے تو ان کا نام صرف امین لکھا ہے لیکن سید شمس اللہ قادری نے اردوئے قدیم میں پورا نام ملک محمد امین کمال دیا ہے اور انہیں سلطان بہادر اور محمود شاہ ثانی کے زمانے کا شاعر کہا ہے[2]۔ یہ زمانہ ۹۳۲ھ سے لے کر ۹۴۳ھ تک کا ہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ امین کمال ان بادشاہوں کے ندیمانِ خاص میں سے تھے۔

ملک محمد امین کمال میں لطیفہ گوئی اور بدیہہ گوئی کا خاص وصف موجود تھا۔ اس سلسلے میں مرأۃ سکندری دیکھیے جس میں ان کی زندگی کے اس رُخ سے تعارف بھی کرایا گیا ہے اور عملاً مثالیں بھی دی ہیں۔ گجرات (بھارت) کے ایک بزرگ شاہ عالم سراج الدین سید محمد حسنیؒ سے ان کی خاص ارادت تھی۔ انھوں نے بہرام گور اور حسن بانو کا قصہ نظم کرنا شروع کیا تھا لیکن اسے پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکے تھے۔ بعد میں دولت نام کے ایک دوسرے شاعر نے اسے مکمل کیا۔ یہ سنہ ۱۳۰۰ھ میں بمبئی سے چھپ بھی چکا ہے۔ نصیر الدین ہاشمی نے کتاب یورپ میں دکنی مخطوطات میں اس کے مخطوطات کے یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہونے کا ذکر بھی کیا[3]۔

بہرام و حسن بانو جنوبی ہند کی ان مثنویوں کی ایک کڑی ہے جو خالص عشقیہ رنگ میں لکھی گئی ہیں اور جن میں الفاظ و علائم کے کوئی تاویلی اور مجازی معنی تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔

---

[1]: دکن میں اُردو، ص ۱۲۹

[2]: اُردوئے قدیم، ص ۷۶

[3]: یورپ میں دکنی مخطوطات، ص ۲۱۷

اس مثنوی کا روایتی تعلق وجہی کی قطب مُشتری، احمد کی لیلیٰ مجنوں اور ابن نشاطی کی پھول بن طرز کی مثنویوں سے ہے جو خالص عشقیہ مگر جذبات و معاشرت کے اعتبار سے خالص مشرقی لمس لیے ہوئے ہے۔ ان میں حمد، نعت، منقبت وغیرہ کے عنوانات سے مذہبی مواد بھی ملتا ہے اور کہیں کہیں اخلاق و عرفان کی جھلک بھی ہے۔ ایک اور دکنی شاعر طبعی نے بھی جو عبداللہ قطب شاہ کے آخری دور کا اور ابوالحسن تانا شاہ کے دربار کا شاعر تھا، بہرام گور کا افسانہ دکنی میں نظم کیا ہے۔ اس کا نام اس نے بہرام وگل اندام رکھا ہے۔ یہ ۱۰۸۱ھ کی تصنیف ہے اور اس کا ایک نسخہ کتب خانہ برٹش میوزیم لندن میں موجود ہے[1]۔

غلام علی کی پدماوت، غواصی کی سیف الملوک، مقیمی کی چندر بدن و مہیار، امین کی یوسف زلیخا وغیرہ ملک امین الدین کمال کی مثنوی کی طرز کی ایسی مثنویاں ہیں جن میں حمد، نعت، منقبت کے علاوہ کہیں نہ کہیں ایسی بات ضرور آجاتی ہے جو عشق کے عام قصے سے ہٹ کر کوئی نہ کوئی اخلاقی عارفانہ یا دینی پہلو لیے ہوئے ہوتی ہے۔ غواصی کی چندا اور لورک میں تو یہ انداز فوق ہے۔ بہرام وحسن بانو کے افسانے میں ایک موقع ایسا آتا ہے جہاں بہرام کا باپ اپنے بیٹے کو سات نصیحتیں کرتا ہے۔ یہ نصیحتیں عشقیہ قصے میں اخلاقی عنصر پیدا کرنے کا سبب بنی ہیں۔ طبعی نے اپنے قصہ بہرام میں ان میں سے ہر نصیحت کو سات سات شعروں میں نظم کیا ہے لیکن ملک محمد امین کمال کا انداز یہ نہیں ہے۔ مسلمانوں نے اس رجحان کو برصغیر کی ہر زبان کے عشقیہ قصوں میں قائم رکھا ہے اور عرفان و تصوف، پند و نصیحت وغیرہ کی باتیں ہر قصہ میں کی ہیں چاہے وہ نثر میں ہو یا نظم میں سوائے جدید دور کے۔

عبدالملک بہروچی

عبدالملک بہروچی گیارہویں صدی ہجری کے شاعر تھے۔ عبد ان کا تخلص معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ عبدالملک عبد کے نام سے مشہور تھے۔ اپنے شعروں میں وہ پورا نام استعمال کرتے دکھائی دیتے ہیں

---

[1]: یورپ میں دکنی مخطوطات از نصیر الدین ہاشمی

کبھی عبدالملک عبد اور کبھی صرف عبد الملک ۔ اپنے آپ کو عاجز، بندہ، اور مسکین کہہ کر بھی پکارتے ہیں لیکن یہ انکساری کے طور پر ہے نام یا تخلص کے طور پر نہیں ۔

احمد آباد سے جنوب میں کچھ فاصلے پر ایک قصبہ ہے جس کا نام بھروچ ہے ۔ عبدالملک وہاں کے رہنے والے تھے ۔ اس لیے بھروچی کہلاتے ہیں لیکن عبد الملک نے اپنے وطن میں بہت کم قیام کیا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ سیر و سیاحت میں گزارا ہے ۔ انھوں نے جو مثنویاں لکھی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دینی رجحان اور مذہبی مزاج کے شاعر تھے اور درویش اور فقیر منش تھے ۔ ان کی مثنوی مولود نامہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شیخ احمد کھٹوؒ سے عقیدت رکھتے تھے۔[۱] شیخ کے حالات اور ملفوظات میں، جو تحفۃ المجالس اور مرقاۃ الوصول الی اللہ والرسول کے نام سے ان کے مریدوں نے جمع کیے ہیں، ہندی اشعار بھی ملتے ہیں، ویسے وہ فارسی کے شاعر تھے اور اس میں احمد تخلص کرتے تھے ۔ عبدالملک بھروچی کی ان سے عقیدت نے ان کے قلب و ذہن پر یہ عرفانی اور لسانی اثر ضرور مرتب کیا ہوگا ۔

وفات نامہ، مولود نامہ ہی کا تتمہ ہے ۔ پہلی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اور دوسری وفات کے حالات و واقعات سے متعلق ہے، اس کی زبان بھی قدیم اردو ہے، دکنی یا گوجری۔ یہ ایک ضخیم مثنوی ہے، اس کا ایک مخطوطہ بمبئی یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔[۲] اس میں اخبارات و روایات کی بنا پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے اور کچھ عرصہ بعد تک کے حالات ہیں ۔ اس زمانے تک اردو میں مولود نامے اور وفات نامے نہ ہونے کے برابر تھے ۔ قطب شاہی اور عادل شاہی ادوار کے دکنی شاعروں میں بھی اس کی مثال نہیں ملتی ۔ البتہ پنجاب میں محبوب عالم عرف شیخ جیونؒ نے درد نامہ کے نام سے جو مثنوی لکھی ہے وہ وفات نامہ کا بدل ہو سکتی ہے ۔ اس میں نہ صرف یہ کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا ذکر ہے بلکہ حضرت عائشہ

---

[۱] : گجرات کی مذہبی مثنویاں از ظہیر الدین مدنی، رسالہ، نوائے ادب، جولائی ۱۹۵۴ (ص ۵ تا ۳۲)۔

[۲] : تذکرہ اردو مخطوطات جلد اوّل از محی الدین قادری زور ، ص ۲۳

صدیقہؓ، حضرت فاطمۃ الزہراؓ اور حضرات شیخینؓ کی طرف سے حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم کے غم میں مرثیے بھی لکھے گئے ہیں۔ یہ اردو مثنویات کی تاریخ میں ایک اہم بات ہے مغلیہ دور میں جاکر ایک وفات نامہ سید شاہ حسین ذوقی کا بھی ملتا ہے۔ ذوقی کا تعلق بھی جنوبی ہند سے ہے۔

بہروچی کی مثنوی مولود نامہ بھی ضخیم ہے۔ اس میں تقریباً ۲۵۰ اشعار ہیں جب کہ مثنوی وفات نامہ میں ۳۴۸ ہیں۔ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا حال ہے اور یہ وفات نامہ سے تقریباً تین سال بعد لکھی گئی ہے۔ اس نام سے بھی قدیم اُردو میں کوئی اور مثنوی نظر نہیں آتی۔ شفاعت نامہ، نور نامہ وغیرہ کے عنوانات سے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات پر بعض مثنویاں اور نظمیں موجود ہیں لیکن ان کی وفات اور پیدائش کے موضوع پر قدیم اُردو میں سرمایہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس لحاظ سے عبدالملک بہروچی کی ان دو مثنویوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ بعد میں بہت سے وفات نامے اور میلاد نامے لکھے گئے ہیں خصوصاً انیسویں اور بیسویں صدی کے اُردو ادب میں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس کثرت کا سبب میلاد کی محافل کا کثرت سے انعقاد بھی کہا جا سکتا ہے۔ ابتداء میں ان میلاد ناموں کا کینوس اتنا وسیع نہیں تھا جتنا بعد میں ہو گیا۔ بعد میں ان میلاد ناموں نے وسعت پاکر سیرت کے دوسرے واقعات کو بھی سمو لیا ہے۔ عبدالملک بہروچی کی مثنوی مولود نامہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے گرد گھومنے والے حالات ہی ہیں اور ان کا مواد قرآن، حدیث، روایت، خبر وغیرہ سے لیا گیا ہے اور بہروچی نے مثنوی میں اس کا ذکر بھی کیا ہے۔

وفات نامہ ہو یا میلاد نامہ، نور نامہ ہو یا شفاعت نامہ، معراج نامہ ہو یا جنگ نامہ یہ سب نعت ہی کی وسعت یافتہ شکلیں ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے محاسن و محامد بیان کرنے کا نام نعت ہے خواہ یہ نظم میں ہو یا نثر میں۔ اس لیے ایسے واقعات و حالات بھی نعت ہی کے ضمن میں آجاتے ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل اور شمائل بیان کرتے ہیں یا بیان کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ ان ناموں میں یہی چیزیں ہوتی ہیں لیکن ذرا پھیلی ہوئی شکل میں۔

عبدالملک بہروچی کی تیسری مثنوی نامہ حضرت سلطان ہے اس کو وصیت نامہ

سلطان محی الدین بھی کہتے ہیں[1]۔ یہ پچاس شعروں کی مختصر مثنوی ہے۔ اس مثنوی میں حضرت غوث الاعظم عبدالقادر جیلانیؒ کی مدح اور فضائل کا بیان ہے۔ حضرت غوث الاعظمؒ کو پیرانِ پیر کی حیثیت سے ماننے کی وجہ سے ہر مسلک روحانی کے بزرگ ان کو مانتے ہیں اور ان کی توصیف و تعریف بھی کرتے ہیں۔ پیران پیر کا اپنا مسلک قادریہ کہلاتا ہے جو ان کے نام عبدالقادر کی نسبت سے موسوم ہے۔ سہروردی، چشتی، نقشبندی بھی حضرت پیران پیر کو اپنا پیر سمجھتے ہیں۔ اس لیے ان کی مدح ہر مسلک روحانی کے بزرگوں اور شاعروں کے ہاں ملتی ہے جنوبی ہندی کے شاعروں اور بزرگوں نے قدیم سے اس طرف توجہ دی ہے۔ عادل شاہی دور کے ایک شاعر اور مرثیہ نگار افضل نے محی الدین نامہ کے نام سے ان پر ایک مستقل نظم لکھی ہے۔ مغلیہ دور کے ایک جنوبی ہند کے شاعر سید شاہ حسین ذوقی نے غوث نامہ کے نام سے مثنوی لکھی ہے۔ پنجاب کے ابتدائی شاعروں نے تو ان کی منقبت میں بہت کچھ کہا ہے[2] جس کی وجہ غالباً وہ طوائف الملوکی اور سکھا شاہی تھی جس نے پنجاب کے مسلمانوں کو بے بس، بے سہارا اور نادار بنا کر رکھ دیا تھا اور بے سہارگی اور بے چارگی کی اس دنیا میں انہیں حضرت غوث الاعظمؒ کی دستگیری مددگار دکھائی دیتی تھی۔ اس لیے انہوں نے حضرت غوث الاعظمؒ کے حضور فریاد اور پکار کے انداز میں کئی مناجاتیں لکھی ہیں۔ بٹالہ (ضلع گورداسپور بھارت) میں تو باقاعدہ قادری خانقاہی مرکز قائم ہو چکا تھا اور اس مرکز سے متعلق بزرگوں اور شاعروں نے جن میں شیخ محمد نور، شیخ موسیٰ، شیخ نصیر الحق، دل محمد شاد وغیرہ اہم ہیں جناب غوث الاعظمؒ کے حضور فریادانہ مناجاتیں کہی ہیں۔ عبدالملک بہروچی کا وصیت نامہ مکمل طور پر اس قبیل کا تو نہیں لیکن فریادی اور مناجاتی انداز اس میں بھی ہے۔ باقی حصہ فضائل

---

[1]: تذکرہ اردو مخطوطات از محی الدین قادری زور، جلد اول، مخطوطہ ۱۰۸، ص ۱۴۳ اور جلد دوم مخطوطہ نمبر ۲۳۷ و نمبر ۳۲۷

[2]: دیکھیے پنجاب میں اردو از حافظ محمود شیرانی، ص ۳۱۴ تا ص ۳۵۵

ومناقب پر مشتمل ہے۔ انداز بیانیہ اور واقعاتی ہے۔

عابد شاہ

عابد شاہ دکنی دور کے ایک نثر نگار ہیں۔ ان کے ایک صوفیانہ رسالے کا ذکر ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے فہرست ادارہ ادبیات اردو حیدر آباد (دکن) میں کیا ہے۔ یہ رسالہ نثر میں ہے اور اس کا نام گلزار السالکین ہے۔ عابد شاہ ایک درویش منش شاعر تھے اور جنوبی ہند کے ایک بزرگ شاہ راجو حسینی چشتی کے مرید تھے۔ یہ رسالہ ۱۹۰۲ء سے پہلے کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں عارفوں اور سالکوں کی باتیں اور رموز ہیں۔ زبان اس قدیم اردو سے جو عام طور پر دکن میں مروج تھی ہٹ کر ہے موضوع تقریباً وہی ہے جو اس دور کے جملہ تصوف نگاروں کا تھا یعنی توحید اور عرفان۔

رسالے کی عبارت اس قسم کی ہے:

> اوّل ثنا صفت کرنا اللہ تعالیٰ کا کہ قادر ہے تمام چیز اوپر قدرت رکھتا ہے ہر شے میں حاضر و ناظر ہے جیسا کہ شکر مٹھائی میں اور باس پھول میں۔ اسی طرح سب میں صنعت گری رکھتا ہے۔

یہ عبارت دکن کی ابتدائی دور کی تحریروں کے مقابلے میں زیادہ صاف، رواں اور اردوئے معلیٰ شاہجہان آباد کے قریب ہے۔ اس میں ایک بھی نامانوس لفظ نہیں اور اس میں وہ اجنبیت نہیں پائی جاتی جو عام طور پر جنوبی ہند کی تحریروں میں ہے۔ فارسی کا گہرا اثر ہے اور اوّل ثنا، صفت، اللہ تعالیٰ، قادر، قدرت، شئے، حاضر ناظر، صنعت گری وغیرہ اسی اثر کو ظاہر کرتے ہیں اس کی وجہ زمانے کا وہ بعد اور لسانی سفر کا وہ فاصلہ ہے جو قدیم دکنی شاعروں اور عابد شاہ میں ہے۔

معظّم

معظم، سکندر عادل شاہ کے زمانے کا ایک صوفی شاعر ہے جو حضرت امین الدین اعلیٰ چشتی کا معتقد تھا۔ نصیر الدین ہاشمی نے دکن میں اردو لکھا ہے[1] کہ وہ قادر کا شاگرد تھا۔ قادر بھی

[1] دکن میں اردو (حیدر آباد دکن ایڈیشن)، ص ۱۷۴

حضرت امین الدین اعلیٰؒ کے مرید بلکہ خلیفہ تھے۔[1] نام شاہ عبدالقادر اور تخلص قادر تھا۔ عام طور پر قادر لنگا کے نام سے مشہور تھے۔ معظم اور قادر کا ہم مسلک ہونا ان کی شاگردی اور استادی میں گہرے تعلق کا پتہ دیتا ہے۔

معظم کی دو مثنویاں شجرۃ الاتقیا اور گنج مخفی کے نام سے ہیں۔ قدیم دکنی زبان سے یہ قدرے فارسی آمیز دکنی میں لکھی گئی ہیں۔

الٰہی توں قادر ہے صاحب غنی
تو رازق مطلق ہے سمرت دہی
ترا نام قادر سزا وار ہے
ترے نام کا سب کو ارہار ہے

اب جا توں بیجا پلور ٭ ہے پلور وہاں شہ پور
وہاں امین علی ہے پیر ٭ ہے روشن دیکھ ضمیر
ہے پیر تیرا تو قادر ٭ اور حاضر ہے اور ناظر

ان اشعار سے معظم کی اپنے پیر سے عقیدت کا علم بھی ہوتا ہے اور عقائد کا بھی۔

دونوں مثنویاں دین و عرفان کے موضوع پر ہیں اور دونوں کی زبان اُردوئے معلّےٰ سے قریب تر اور دکنی زبان سے دور تر ہے ؎

الٰہی تہیں قادر ذوالجلال
تو صاحب جمیل و یحب الجمال

---

[1] دکن میں اُردو۔ ص ۱۷۰ (حیدر آباد دکن، ۱۹۳۶ء ایڈیشن)

شاہ عبدالقادر، قادر

شاہ عبدالقادر نام، قادر تخلص، حضرت امین الدین اعلیٰ فرزند شاہ برہان الدین جانمؒ کے خلیفہ تھے۔ مصنف اولیائے بیجاپور نے ان کا ذکر کیا ہے۔ تذکرہ شعرائے اردو از میر حسن اور فہرست کتب خانہ اودھ از اسپرنگر میں جس قادر کا ذکر ہے وہ ان سے الگ ہیں۔ شاہ عبدالقادر کی غزلیہ شاعری بھی ہے جو تصوف و عرفان کے مضامین پر مشتمل ہے۔ حقیقت کے عنوان سے صوفیانہ موضوع پر اشعار انہوں نے الگ بھی لکھے ہیں۔ نصیرالدین ہاشمی نے کتاب دکن میں اُردو میں ان کی ایک منظوم تصنیف خاتون جنت کا بھی نام لیا ہے[1]۔ ادارہ ادبیات اُردو حیدرآباد (دکن) میں اس کا مخطوطہ موجود ہے۔ ہاشمی ان کی شاعری پر رائے دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ قادر کا کلام اس لحاظ سے خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ انھوں نے غزل میں عام رواج کے خلاف اخلاقی مضامین بیان کیے ہیں۔ حسب رواج تصوف کے مسائل کو حقیقت کے عنوان سے لکھا ہے۔

شاہ امین علی پیا مجھے سنبھال بہوت ناتواں ہے میرا حال

شاہ امین علی پیا مجھے جلا تیری محبت کا مَے مجھے پلا

میرے دل کے چمن کا توں پھول کھلا

شاہ امین علی پیا مجھے تیری آس جب محبوب رہے تیری چرن پاس

تو سائیں میرا میں تیری داس

—

غزل کا نمونہ: نہ کر کسی پہ زبردستی نہ کسی کا دل دوکھانا ہے

بینی کیا مال پرستی خدا کوں موں دیکھانا ہے

تکبر کے جو مسند پر غروری کا جو تکیہ دھر

رہا کیا بیٹھ غفلت کر تجھے دنیا تھے جانا ہے

---

[1] دکن میں اُردو، ص ۱۷۰ (حیدرآباد ۱۹۳۶ء ایڈیشن)

عبدل

عادل شاہی عہد کے ایک دکنی شاعر تھے۔ انھوں نے ابراہیم عادل شاہ کے بعض حالات میں ایک طویل مثنوی ابراہیم نامہ کے نام سے لکھی ہے جس میں انہوں نے خواجہ بندہ نواز گیسو دراز چشتیؒ کی منقبت کا عنوان بھی قائم کیا ہے اس سے نہ صرف شاعر کی حضرت خواجہ سے عقیدت کا اظہار ہوتا ہے بلکہ اس سے اس بات کو بھی تقویت ملتی ہے کہ خود ابراہیم عادل شاہ بھی حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ سے عقیدت رکھتا تھا۔ یہ بات ان کی تصنیف نورس سے بھی ظاہر ہوتی ہے۔ عبدل خود سلطان کا شاگرد تھا جو سلطان میراں شاہ معروف کے مرید اور خلیفہ تھے۔ ان کا ذکر محی الدین نامہ کے مصنف افضل نے کیا ہے۔ جو خود بھی میراں شاہ معروف کے مرید تھے۔ عقیدہ کے لحاظ سے یہ قادری سلسلے کے درویش تھے۔ عبدل کا تعلق چشتیہ سلسلے سے خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی منقبت کے حوالے سے معلوم ہوتا ہے۔[1]

سلطان ابوالحسن تاناشاہ

سلطان ابوالحسن تاناشاہ قطب شاہی خاندان کے ایک تاجدار تھے۔[2] انھیں خدابندہ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ شاہ راجو حسنیؒ چشتی سے ارادت رکھتے تھے۔ شاہ راجوؒ حسنی مشہور چشتیہ بزرگ خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کی اولاد میں سے تھے۔ مرزا علی لطف نے تذکرہ گلشن ہند میں سلطان کا یہ شعر دیا ہے۔

کس در کہوں کاں جاؤں میں مجھ دل پہ کٹھن بجھراتˇ
یک بات ہوں گے سبھی یہاں جیوں بارہ بات ہے

---

[1] دکن میں اُردو از نصیر الدین ہاشمی (حیدر آباد دکن ۱۹۳۶ء ایڈیشن)، ص ۸۸

[2] دکن میں اُردو از نصیر الدین ہاشمی (حیدر آباد دکن ۱۹۳۶ء ایڈیشن)، ص ۶۱

محمد خلیل شطاری الیمنی نے اپنی کتاب بحرِ محیط میں بھی ان کا کچھ کلام درج کیا ہے۔

اے سرو، گلبدن تو ذرا ٹک چمن میں آ
جیوں گل شگفتہ ہو کے مری انجمن میں آ
کب لگ رہے گا جیوں لب تصویر بے سخن
اے شوق خود پسند تو ٹک بھی سخن میں آ
اے جانِ بو الحسن توں اپے خوش لٹک سے
بند قبا کوں کھول کے صحن چمن میں آ

سلطان کی یہ غزل قدیم دکنی زبان سے ہٹ کر اُردوئے معلّٰی کے قریب تر ہے۔

مشتاق

مشتاق بہمنی دور کا شاعر ہے اور اس نے سلطان محمود شاہ بہمنی اور سلطان کلیم اللہ بہمنی کا زمانہ دیکھا ہے[1] سلطان بریدیہ میں سے بھی بعض ابتدائی حکمرانوں کا زمانہ اس کی نظر سے گزرا ہے۔ وہ علی برید اوّل کے زمانے (۹۴۹ھ تا ۹۸۷ھ) کے زمانے میں بقیدِ حیات تھے[2] ڈاکٹر نذیر احمد نے اپنے ایک مضمون میں مشتاق کے متعلق لکھا ہے[3] کہ وہ بہمنی دور کا شاعر نہیں تھا، بلکہ اس کا دور گیارہویں صدی ہجری کی ابتداء کا قطب شاہی یا عادل شاہی دور تھا۔ لیکن سخاوت مرزا نے اپنے ایک مضمون میں[4] دلائل و شواہد کے ساتھ اس دعویٰ کی تردید کی ہے اور اسے بہمنیہ دور کا شاعر ہی ثابت کیا ہے اور اس سلسلے میں

---

[1] : مقالہ فہرست مخطوطات پر ایک سرسری نظر از سخاوت مرزا' رسالہ ہندوستانی ادب' جنوری ۱۹۴۷ء ص ۲۹

[2] : مقالہ قدیم اُردو کی ایک نایاب بیاض از سخاوت مرزا' رسالہ' اُردو، اکتوبر ۱۹۵۰ء و ۱۹۵۴ -

[3] : مضمون مطبوعہ رسالہ اردو' ادب، علی گڑھ' جون ۱۹۵۸ء

[4] مضمون کیا مشتاق بہمنی دور کا شاعر نہیں تھا از سخاوت مرزا' رسالہ اردو' جنوری و اپریل ۱۹۵۹ء

یہ بھی کہا ہے کہ مشتاق نے اپنے قصیدے میں جن خلیل اللہ کی منقبت بیان کی ہے وہ ان شاہ خلیل اللہ خطاط بادشاہ قلم سے مختلف ہیں جن کا تعلق عادل شاہی دور سے تھا۔ ان کے مطابق اس بات کی تصدیق بھوگ بھل کے مصنف قریشی کی زبان سے بھی ہوتی ہے۔ قریشی نے سلطان محمود شاہ بہمنی اور بعض بریدشاہی سلاطین کا زمانہ دیکھا ہے۔ اس نے اپنی مثنوی میں کئی اچھے اچھے شاعروں کی موجودگی کا اعتراف کیا ہے جن میں مشتاق کے اس دور میں موجود ہونے کا اشارہ بھی ملتا ہے۔

مشتاق نے ایک مرصع قصیدے میں حضرت شاہ خلیل اللہ بُت شکن کی مدح کی ہے۔ سخاوت مرزا نے کہا ہے کہ یہ وہ شاہ خلیل اللہ معلوم نہیں ہوتے جن کا سلطان احمد شاہ بہمنی مرید تھا۔ بہت ممکن ہے آپ کی اولاد یا سجادگان میں سے کوئی بزرگ ہوں۔ قصیدے کا عنوان ہے "قصیدہ در مدح خلیل نعمت اللہ"۔ یہ سیّد خلیل حضرت شاہ نعمت اللہ کرمانی کے فرزند نہیں ہیں بلکہ یہ وہ سیّد خلیل ہیں جن کے فرزند شمس الدین شاہ محمد اور شاہ کاظم تھے۔ یہ سیّد خلیل بھی بت شکن کہلاتے تھے اور لفظ ثانی کا ان کے نام کے ساتھ اضافہ ہوتا تھا یعنی سید خلیل اللہ بت شکن ثانی۔

مشتاق نے سید خلیل اللہ بت شکن کے علاوہ سیّد شاہ عبدالقادر عرف سیّد میاں ابن عبدالمن اللہ حسینی کی بھی مدح سرائی کی ہے۔ اس مدحیہ قصیدے کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں تیغ، خنجر، نیزہ، علم، نقارہ وغیرہ کا ذکر نہیں لیکن مدح سرائی میں شاہانہ شکوہ موجود ہے۔ اس لیے کہ فقیر اصل سلطان ہوتا ہے۔ ان قصائد کی زبان اور ان میں شاعرانہ نازک خیالیوں اور لطافتوں کو دیکھتے ہوئے تعجب ہوتا ہے کہ بہمنی دور ہی میں اردو زبان اتنی صاف ہو چکی تھی

مطلع قصیدہ در مدح سید میاں

فیض کا ساقی دیا دل کے تپش حُب کا شراب
طبع دیا ہو نسیم فہم کے گل کوں شباب

ایک غزل کا مطلع دیکھیے:

او کسوت کیسری کر تن چمن میا نے چلی ہے آ
رہے کھلنے کوں بتوں دستی او چنبے کی کلی ہے آ

لطفی

لطفی تخلص کے ایک شاعر بہمنی دور سے تعلق رکھتے ہیں، وہ مشتاق کے ہم عصر تھے دونوں شاعروں نے ایک ہی بزرگ شاہ محمد کا ذکر کیا ہے جو حضرت خلیل اللہ بت شکن کی اولاد میں سے معلوم ہوتے ہیں۔ سخاوت مرزا نے مقالہ اردو کی ایک نایاب بیاض میں ان کا ذکر کیا ہے۔ اور صرف اتنا لکھا ہے کہ دکن کے شاعر تھے اور پھر ان سے غزل کا ایک شعر بھی منسوب کیا ہے۔ میر لطف علی المتخلص بہ لطفی بھی دکن کے شاعر گزرے ہیں وہ درویش محمد خان کے نواسے تھے جو آصفیہ دور (۱۱۳۶ھ تا ۱۲۴۰ھ) میں صوبہ برار کے صوبیدار تھے۔ انھوں نے بہلول صادق کے نام سے اردو میں ایک مثنوی لکھی ہے۔ قیام الدین قائم نے تذکرہ مخزنِ نکات میں بھی ان کا ذکر کیا ہے لیکن یہ بہمنیہ دور کے لطفی سے بہت بعد کے شاعر ہیں۔

مشتاق کی طرح لطفی بھی قصیدہ گو اور غزل گو شاعر تھے۔ انھوں نے ایک زوردار قصیدہ کسی بادشاہ کی مدح میں بھی کہا ہے اور اس میں مشہور ایرانی شاعر ابو العطا بن محمود بن علی المشہور بہ خواجہ کرمانی کا طرز اختیار کیا ہے۔ کرمانی حضرت رکن الدین علاء الدین سمنانیؒ کے مرید تھے۔ خواجہ کرمانی کا مشہور قصیدہ اسی بحر اور قافیہ میں ہے۔ اس طرز میں ایک قصیدہ سلطان علی عادل شاہ ثانی المتخلص بہ شاہی نے بھی لکھا ہے۔

مشتاق کی طرح لطفی کے قصیدے میں بھی فارسی الفاظ و تراکیب کا غلبہ ہے جو عام طور پر اس دور کے کئی دوسرے دکنی شاعروں میں کم نظر آتا ہے۔ غالباً قصیدے کے اسلوب میں شکوہ پیدا کرنے کے لیے ان دونوں شاعروں نے یہ انداز اختیار کیا ہے۔ اس سے قصیدے کی علمی اور فنی ساخت قائم رہتی ہے۔

لطفی کے قصیدے کے دو شعر:

لہ: رسالہ اردو اکتوبر ۱۹۵۰

مملکت دارا لیا بہمن اسفند یار
تخت فریدوں دیا بربت سیمیں ذقن
اے شۂ دلدل سوار فارس خنجر گداز
صفدر شرزہ شکار، شنزدہ شکر شکن

لطفی کی غزل کی زبان بڑی صاف اور رواں ہے اور اس میں وہ اشکال اور دقت نہیں جو دکنی شاعروں کے مقامی الفاظ کو کثرت سے داخل کرنے کی وجہ سے دوسرے شاعروں میں نظر آتی ہے۔

مطلع :

خلوت سے سجن کے میں، موم کی بتی ہوں
یک پاؤں پر کھڑی ہوں جلنے پرت پتی ہوں

حسینی

حسینی، دکن کے شاعر اور حضرت امین الدین اعلیٰ چشتیؒ کے مرید تھے۔[1] دکنی زبان میں ایک مثنوی روضۃ الشہدا کے نام سے ملتی ہے، جس کا سن تصنیف ۱۱۳۶ھ ہے۔ حامد اللہ ندوی نے اپنے مقالہ اُردو مخطوطات میں حسینی کی بجائے الٰہی حسینی نام لکھا ہے۔[2] یہ ایک طویل مثنوی ہے جو اسی نام کی فارسی مثنوی سے دکنی زبان میں ترجمہ کی گئی ہے۔ مثنوی کافی ضخیم ہے اور اس کے تقریباً ۵۰۲ صفحات ہیں۔ اس میں پہلے حمد و نعت ہے اور پھر اہل بیت کا ذکر اور حضرت حسینؓ کی شہادت کا حال ہے۔ ولی ویلوری نے بھی روضۃ الشہدا کے نام سے مثنوی لکھی ہے جو ۱۱۱۹ھ کی تصنیف ہے۔ اس لیے یہ حسینی کی مثنوی سے پہلے

[1] : دکن میں اُردو از نصیر الدین ہاشمی ص ۲۰۱

[2] : رسالہ نوائے ادب، بمبئی، جنوری ۱۹۵۵، ص ۱۱۱

کی ہے۔ حسینی کی مثنوی کی زبان بڑی صاف اور شمالی ہند میں مروج اُردو کے قریب تر ہے۔

حسینی راز دار سرّ شہدا
نہیں پوشیدہ ہے سب پر ہویدا
عزیزِ مصر عزت کا پسر تھا
وفا خانی لقب اس کا نشر تھا
سخن کے دُرج کا تھا دُر فشاں او
اتھا شاہزادۂ ماژندراں او
خدایا گور کوں کر اس کے پُر نور
اسے ہم نام سوں کر اس کے محشور

خواجہ رحمت اللہ رحمت

خواجہ رحمت اللہ نام، رحمت تخلص، تورانی الاصل حسینی سیّد تھے۔ ان کے والد آصف جاہ اوّل کے زمانے میں دکن میں آئے اور بیجاپور کے ایک گاؤں بنام بلگاؤں میں آباد ہو گئے۔ خواجہ رحمت اسی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ وہ ابتدائی دور میں دنیادار رہے۔ پھر مکہ معظمہ جاکر ایک بزرگ سیّد محمد اشرف مکّی سے فیض یاب ہوئے۔ تذکرہ اولیائے دکن کے مؤلف عبدالجبار ملکاپوری نے لکھا ہے[1] کہ تواد دیگر کے قلعہ دار عبدالقادر خاں نے ان کے نام پر ایک گاؤں رحمت آباد کی بنیاد ڈالی۔

رحمت خواجہ رحمت نائب رسول اللہ کے نام سے مشہور تھے۔ تنبیہہ النساء کے نام سے ان سے ایک مثنوی یادگار ہے جس کے مخطوطے کے چند نسخے کتب خانہ ادارہ ادبیات اُردو حیدر آباد (دکن) میں موجود ہیں۔ اس کتب خانہ کی فہرست

---

[1] تذکرہ اولیائے دکن (محبوب الزمن) از عبدالجبار ملکاپوری، جلد اوّل، ص ۳۶۳

میں سید محی الدین قادری زور نے اس مثنوی کا اختصاری تعارف بھی کرایا ہے[1] جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا موضوع دینی معاشرتی ہے اور مقصود عورتوں کی تعلیم و تربیت اور اصلاح ہے خواجہ رحمت نے اس میں ان مذہبی برائیوں اور بے کار رسوم و رواج کے خلاف آواز اٹھائی ہے جن کا مسلمانوں کے نسوانی معاشرہ پر اثر تھا۔ انھوں نے مسلمان عورت کے مشاغل و تقاریب کا رُخ فقہ و دین کی طرف موڑنے کی کوشش کی ہے اور اس طرح زندگی کے معاشرتی میدان میں بھی مسلمان عورت کو مسلمان بنائے رکھنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس مثنوی کے علاوہ ان کی دو اور مثنویاں بھی کہی جاتی ہیں۔ نصیرالدین ہاشمی نے کتاب دکن میں اردو میں جو یہ فقرہ لکھا ہے کہ ان کی چند مثنویاں یادگار ہیں[2] اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی اور مثنویاں بھی ہیں لیکن انھوں نے کسی اور مثنوی کا نام نہیں لکھا۔

صوفی شاہ کاظم

کاظم تخلص کے دو دکنی شاعر گزرے ہیں۔ اسد علی خان تمنّا نے تذکرہ گل عجائب میں ان میں سے صوفی شاہ کاظم کا ذکر کیا ہے[3] اور انھیں اپنا ہم درس بتایا ہے اور ان کو اقلیم سخن کے ناظم کے نام سے یاد کیا ہے۔ وہ درویش منش اور معتقد صوفیا نظر آتے ہیں۔ ان میں سے دوسرے کا نام کاظم علی تھا۔ یہ کاظم حیدر آباد (دکن) کے امیرزادے اور شاعر تھے اور ایک درویش ادجالا شاہ کے مرید یا معتقد تھے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے ادارہ ادبیات حیدر آباد کی فہرست میں ان کے کلیات کا بھی ذکر کیا ہے[4] جو

---

[1] : فہرست اُردو مخطوطات از محی الدین قادری زور، ص ۱۵

[2] : دکن میں اردو از نصیرالدین ہاشمی، ص ۳۲۸

[3] : گل عجائب، ذکر کاظم

[4] : فہرست اُردو مخطوطات، ص ۲۱۰

١١٩٩ھ میں مرتب ہوا تھا۔ اس میں غزلیں نظمیں، مرثیے سب کچھ ہے مخمس اور شہر آشوب بھی ہیں آپنے مرشد کی مدح میں لکھتے ہیں :

شفیع و حامی روز جزا اوجالا شاہ — ولی و والی ہر دوسرا اوجالا شاہ
خدا کی راہ کے ہیں پیشوا اوجالا شاہ — حبیب و عاشق حق بے ریا اوجالا شاہ

یہ زبان شمالی ہند کی اس زبان کی طرز کی ہے جو میر و سودا کے زمانے میں تھی۔ شمالی ہند میں یہی دور میر و سودا کا ہے۔[1]

نصیر الدین ہاشمی نے بھی کاظم تخلص کے ایک شاعر کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ گولکنڈہ کا شاعر تھا اور صرف مرثیہ گوئی اس کا پیشہ تھا۔ ظاہر ہے یہ کاظم زیر نظر "کاظمین" سے الگ اور پہلے کے شاعر ہیں۔

شاہ عشق اللہؒ عاشق
(متوفی ۱۱۴۴ھ)

شاہ عشق اللہ نام اور عاشق تخلص، شاہ نظام الدین ثانیؒ اورنگ آبادی چشتی کے مرید تھے اخلاق و تصوف کے موضوع پر انہوں نے اشارۃ الغافلین کے نام سے ایک مثنوی لکھی ہے جس میں فضیلت وضو، نماز، بدکرداری، سخاوت، حرام، عورت، قیامت، بہشت، عقل اور عشق جیسے موضوعات ہیں۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے فہرست ادارہ مخطوطات اُردو حیدرآباد (دکن) میں اس کا ذکر کیا ہے۔

نظام الدین ثانی ہے ثانی علی — بتایا مجھے اون خفی ہور جلی
واچشت کے گھر کا ہے جس پور یار — کہ عالم ہے اس فیض کا انتظار

---

[1] دکن میں اُردو (حیدرآباد دکن ۱۹۳۶ء ایڈیشن) 6 ص ۱۸۷

یہ چند نام مثالاً ہیں بعد میں جب اُردو شاعری کا باقاعدہ آغاز ہوا اور اُردو کا مرکز دلّی منتقل ہو گیا تو اس وقت کافی تعداد ایسے شاعروں کی نظر آئے گی جن کا ارادۃً یا عقیدۃً مسلک چشتیہ سے تعلق رہا ہے اور ایک دو بزرگ تو ایسے بھی ہیں جن کی آغوش سلوک میں پلنے والے شاعر کافی تعداد میں ہوئے ہیں۔ ان میں مولانا فخرالدین چشتی دہلویؒ کا نام لیا جا سکتا ہے لیکن زیرِ نظر کتاب کا موضوع چونکہ صرف ایسے زمانے کے شاعروں ادیبوں اور صوفیا تک محدود رہنے کا تقاضا کرتا ہے جنہوں نے اُردو کی ابتدائی نشوونما میں تھوڑا بہت کام کیا ہے۔ اس لیے اس کتاب میں بعد کے صوفیا، شعرا اور ادبا کو شامل نہیں کیا گیا۔ اس دور کے لیے اردو شاعروں کے تذکرے اور اُردو زبان و ادب کی تواریخ دیکھی جا سکتی ہیں۔

PCPPI–4639(97) NLA—18-9-97—500

Urduay Qadeem
Aur
Chishti Sufiya

Dr. A.D. Nasim

National Language Authority
Pakistan